یہ گیت ادھورے



دیباچہ

زیرِ نظر کتاب "یہ گیت اُدھورے" معاشرے کے ان عناصر کی رگِ حیات پر ایک نشتر ہے، جو خود تو بھٹک چکے ہوتے ہیں۔ مگر گندی مکھیوں کی طرح ہر جگہ بیٹھ کر قوم کے صاف ستھرے پیراہن پر غلیظ اور بدنما داغ لگاتے رہتے ہیں اور اپنے گھناؤنے کردار کے سایوں میں قوم اور وطن کے معصوم لڑکے اور لڑکیوں کو ایسی راہوں پر ڈال دیتے ہیں۔ جہاں وقت سے پہلے ہی ان کی منزلِ حیات دھندلکوں میں کھو جاتی ہے اور نتیجتاً وہ جرائم پیشہ عناصر بن جاتے ہیں یا ان گندی گلیوں میں کھو جاتے ہیں۔ جہاں سے دین و دنیا کی روسیاہی کے سوا کچھ بھی تو حاصل نہیں ہوتا

مصلح اور واعظ ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اپنی پاکیزگی اور شستگی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ لیکن جب قوم کی بیٹیاں عریاں حالت میں نائٹ کلبوں میں ناچتی ہیں۔ جب تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنے والدین اور بھائی کی موجودگی میں آرٹس کے نام کی آڑ میں پارٹیوں میں رقص کرتی ہیں۔ جب وہ تنگ اور نیم عُریاں لباس میں سرِعام اپنے جسم کی نمائش کرتی ہیں، تو دل دکھتا ہے اور الفاظ کی ایک سرد آہ خامہ روسیاہ سے نکل ہی جاتی ہے۔

جب قوم کی عزت سکول میں ناچتی ہے۔ کالج میں رقص کرتی ہے۔ پارٹیوں میں پاؤں کوبی کرتی ہے۔ کلبوں میں ٹوئیسٹ، رمبہ اور کوئیک سٹیپ مردوں کے دوش بدوش ناچتی ہے، تو پھر اس بازار میں ناچنے والی طوائف کو معاشرے کا ناسور کیوں

سمجھا جائے۔ اسے حقیر اور ذلیل کیوں مانا جائے۔ سوسائٹی میں اسے کم تر کیوں
سمجھا جائے وہ بھی تو آرٹ ہی ہے نا۔ میں زیادہ گہرائی میں نہیں جانا چاہتا۔ خدا
ہم سب کو سنبھلنے کی توفیق دے۔"

اسلم راہی ایم۔اے

برسات کے دن تھے۔ چھم چھم پانی برس رہا تھا۔ کالج اور سکولوں میں چھٹی
ہو چکی تھی۔ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر گھر کو لوٹتے ہوئے لڑکے
لڑکیاں بارش شروع ہوتے ہی دکانوں کے چھجوں کے نیچے کھڑے ہو گئے تھے۔
بادوباراں کے طوفان کے آگے لمبے لمبے درخت مدقوق جسم کی طرح کانپ رہے
تھے۔ لوگ بڑی بے تابی سے بارش رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر آسمان سے
چھاجوں برستا ہوا مینہ رکنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ ہوٹل اور کیفے خوب آباد
ہو گئے تھے۔ سڑکیں ویران ہو گئیں۔ ہاں کبھی کبھی کوئی کار یا بس گزرتی اور دور
دور تک پانی کے چھینٹے دیتی ہوئی تیزی سے گذر جاتی۔

بارے کافی دیر بعد پانی برس کے کھل گیا۔ لوگ پھر اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے پرے کے پرے اپنی کتابیں اٹھائے پھر فٹ پاتھ پر چل نکلے۔ کراکری کی دکان کے بڑے سے لکڑی چھجے تلے کھڑا ایک خوب گورا چٹا لمبے اور سڈول جسم کا ایک خوبصورت نوجوان بھی اپنی کتابیں بغل میں دبا کر باہر آیا اور سڑک کے کنارے کنارے تیز قدموں سے ایک طرف بڑھنے لگا۔

بڑی سڑک کو چھوڑ کر وہ بائیں طرف مڑا۔ اور چند قدم چلنے کے بعد وہ ریلوے کے کالے پل کے پاس پہنچ گیا۔ دائیں طرف ذرا دور ریلوے سٹیشن پر خوب رش تھا۔ شاید کوئی گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ پل کے اوپر سے گذرنے کی بجائے وہ ریلوے کے ٹوٹے ہوئے لوہے کے جنگلے میں سے ہو کر اپنے سامنے کسی دوشیزہ کی زلفوں کی طرح پھیلی ہوئی دھلی دھلی سی ریلوے لائنوں میں سے گزرنے لگا۔

ابھی وہ چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ دفعتہً اس کی نظر اپنے بائیں طرف ایک ٹ پر پڑی۔ اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے اور وہ لائنوں کے درمیان و بے حواس سی گٹھڑی بنی پڑی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے طرف بڑھا اور اپنی کتابیں ایک پتھر پر رکھ کر اس کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا۔ جواب میں وہ مشکل سے کرا لگی۔ وہ منہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ پر بار بار رک سا جاتا۔ شاید اسے مخاطب کر کے لیے وہ مناسب الفاظ نہ پا رہا تھا۔ آخر پھر اس کا شانہ جھنجھوڑ کر وہ بول ہی

"ماں!"

بڑھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس نیچی نیچی آواز میں کراہتی ہی رہی۔

وہ پریشان ہو گیا۔ بڑی آہستگی سے بڑھیا کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں اوپر اٹھایا اور بڑی نرمی سے پھر اسے پکارا۔

"ماں جی! ——"

وہ اونچے اونچے سانس لیتی ہوئی آنکھیں جھپکا جھپکا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن زبان اٹک اٹک رہی تھی۔ اس نے پھر پوچھا۔

"شاید بیمار ہو۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کہاں جا رہی تھیں۔"

بڑی ہی تکلیف کے احساس سے وہ بولی۔

"ڈاکٹر ——"

"اب کہاں جاؤ گی۔"

اس نے بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے آنکھیں پھڑ پھڑائیں۔

"گھر ——"

"کدھر ہے تمہارا گھر؟"

"وہ —— ادھر ——"

چند ساعت تک وہ کچھ سوچتا رہا۔ پھر بڑھیا کو اپنی پیٹھ پر اٹھایا اور کتابیں بغل میں دبا کر ایک طرف بڑھنے لگا۔ بڑھیا اشاروں سے راستہ بتاتی جاتی تھی۔

اور وہ اسی سمت بڑی تیزی سے چلتا رہا۔

کوئی پندرہ منٹ یوں ہی گزرے تھے کہ بڑھیا نے اُسے ایک مکان کے سامنے رُکنے کو کہا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ بڑھیا کو اس نے نیچے اتارا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس کا مطلب سمجھ گئی اور چابیوں کا ایک گچھا اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور بڑھیا کو اٹھا کر اندر لے گیا۔

وہ کچھ جھجکا۔ مکان کسی زمانے میں بہت اچھا ہوگا۔ لیکن اب تو ڈھنڈار سا دکھائی دے رہا تھا۔ انگنائی میں ایک طرف نواڑی کا پلنگ پڑا تھا۔ جو بارش میں بھیگ گیا تھا۔ ایک طرف آم کا بڑا سا درخت تھا۔ جس میں سے نکلے ہوئے ہرے ہرے شگوفے خوب لہلہا رہے تھے۔ مکان کے عین سامنے باہر گلی میں پیپل کا ایک لمبا سا درخت تھا جس کے پتے ہوا سے اداس اداس سی سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔

مکان کے سارے کمروں کو باہر سے تالے پڑے تھے۔ صرف ایک کمرے کے دروازے کی زنجیر لگی تھی۔ بڑھیا کو پیٹھ پر اٹھائے وہ اس کمرے میں داخل ہوا اور اسے ایک طرف پلنگ پر لٹا دیا۔ بڑھیا اسے تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"کسی نیک ماں باپ کے بیٹے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

وہ اسے غور سے دیکھتا ہوا دھیرے سے بولا۔

"توقیر"

وہ ابھی تک اسے ایک ٹک دیکھتا جا رہا تھا۔ بڑھیا کی سانس اُلجھ اُلجھ رہی تھی۔ رنگ بھی اس کا پیلا پڑ گیا تھا۔ توقیر نے بڑے دُکھ سے پوچھا۔

"کیا اتنے بڑے مکان میں تم اکیلی ہی رہتی ہو؟"

"نہیں میری بیٹی بھی ہے"

"لیکن ——"

وہ کالج گئی ہے۔ ابھی وہ واپس نہیں آئی۔ بڑھیا نے بڑی مشکل سے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔"

"میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"جمیلہ!" وہ نقاہت کے باعث کہیں دور سے بولی۔

توقیر اس کی حالت دیکھ کر اور زیادہ پریشان ہوگیا۔ بغل کے نیچے اپنی کتابیں درست کیں۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر چند ساعتیں اس کی حرارت محسوس کرنے کے بعد وہ بڑی تیزی سے باہر نکلتا ہوا بولا۔

"بہت تیز بخار ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلا لاتا ہوں ——"

جمیلہ اسے منع کرنے کے لیے لب بھی نہ کھولنے پائی تھی کہ وہ باہر جا چکا تھا

ریلوے کی لائنیں عبور کرتے ہوئے توقیر نے اپنی جیب ٹٹولی۔ پانچ روپے کا ایک مڑا تڑا سا نوٹ اور کچھ ریزگاری تھی۔ وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ لائنیں عبور کر کے وہ سڑک پر آیا اور ذہن میں خیالات کا ہجوم ہے۔ کتابوں کی ایک دکان کے

پاس جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر کی بحث و تکرار کے بعد اس نے اپنی کتابیں بیچ د
دوکاندار نے دس روپے کا ایک پرانا سا نوٹ اور دو چاندی کے سے سفید روپے
چھن سے اس کے سامنے کاؤنٹر پر پھینک دیئے۔

ڈاکٹر کے کسی کلینک کی طرف جانے کے لیے سبزی منڈی سے ہو کر گذ
تھا۔ بھیڑ اس قدر تھی کہ تھال پھینکیں تو سر ہی سر جاتے۔ توقیر دکاندار سے رو
لے کر بڑی تیزی سے خلائق کا انبوہ چیرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

ڈاکٹر کو ساتھ لے کر وہ پھر واپس آیا۔ اور جب وہ اس کمرے میں داخل ہ
تو دنگ رہ گیا۔ پلنگ جس پر وہ جمیلہ کو لیٹا چھوڑ کر گیا تھا۔ خالی پڑا تھا۔ وہ بڑی حیـ
سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

آپ ذرا یہیں ٹھہرئیے۔ مریضہ شاید کسی دوسرے کمرے میں چلی گئی ہے
میں دیکھتا ہوں۔ توقیر یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ ڈاکٹر ہکا بکا وہیں کھڑا رہا۔ مکان
سب کمرے جو وہ مقفل چھوڑ کر گیا تھا۔ اب سارے کے سارے کھلے ہو
تھے۔ وہ برآمدے میں آگے بڑھنے لگا۔

ایک کمرے میں اُسے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے دروازے
دستک دی۔ اندر سے جمیلہ کی نحیف سی آواز آئی۔

"توقیر ہے؟"

"وہ ہلکے سے بولا۔"

"جی ہاں ——"

"آجاؤ بیٹا"

وہ اندر داخل ہوا۔ جمیلہ کا لباس تبدیل ہو چکا تھا اور نواڑی کے پلنگ میں وہ
ے صاف ستھرے بستر پر پڑی تھی۔ اس کے پلنگ کی پٹی پر ایک نوخیز سی لڑکی بیٹھی
ی۔ توقیر کی اس سے جب آنکھیں چار ہوئیں۔ اللہ وہ سب کچھ بھول گیا۔

لڑکی کیا تھی پٹاخہ تھی پٹاخہ۔

بھولی بھالی سی صورت۔

ترچھی ترچھی خمار آلود سیاہ موٹی آنکھیں۔

چھریرا بدن۔

نازک نازک ہاتھ پاؤں

اور اس پر نمک اور جامہ زیبی اس کی سنجیدگی اور بے پروائی۔

توقیر پر ایسی پُرتجمل کیفیت طاری ہوگئی۔ جس سے انسان عقل و دانش کھو بیٹھتا
ے۔ وہ تموجات رنگِ حُسن میں کھو گیا۔ اسے یوں معلوم ہوا۔

گویا

چنبلی کی ڈار چمن زاروں میں ناچ اُٹھی ہو۔

یا

لہراتی پون

مسکاتے نیل کنول۔

اور

پرواکی سرسراہٹ اس کی نگاہوں کے سامنے پھڑپھڑا گئی ہو۔

جمیلہ کی آواز نے پاس بیٹھی سی فضا کو ختم کر دیا۔

"بیٹھو بیٹا! ——"

اس کے بدن نے جھرجھری لی اور سنبھل گیا۔

"میں ڈاکٹر کو لایا ہوں ——"

جمیلہ نے پاس بیٹھی ہوئی اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور دھیرے سے کہا

"کنول! تم ذرا دوسرے کمرے میں چلی جاؤ ——"

چپ چاپ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس طرح چلتی ہوئی دونوں کمروں کے دروازہ کی طرف چل دی۔ جیسے کوئی لچکیلی شاخ جھوم جھوم گئی ہو یا صبح چاندنی جُھٹ پٹے کے وقت گھنیر تاریکیوں میں آوارگی کو نکل کھڑی

کنول دونوں کمروں کے درمیانی دروازے کے موٹے سے پھولدار پردے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ توقیر باہر گیا اور ڈاکٹر کو وہیں لے آیا۔ کچھ دیر وہ جمیلہ کا معا رہا پھر توقیر کی طرف دیکھ کے پوچھا۔

"کب سے بیمار ہیں یہ؟"

"جی —— توقیر ہکلا گیا۔"

"پتہ نہیں ——"

ڈاکٹر نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"حیرت ہے۔ آپ کی امی ہیں یہ؟ ——"

توقیر نے سر جھکا لیا۔

"جی نہیں ——"

"کچھ دور نزدیک کی رشتہ دار ہیں ——"

"اوں ہوں"

"عجیب آدمی ہو بھائی۔ ہر بات کا جواب نفی۔"

توقیر نے مختصر سا جواب دیا۔

"میں کالج سے لوٹ رہا تھا کہ یہ ریلوے لائنوں میں گری پڑی تھی۔ میں انہیں وہاں سے اٹھا یا لایا۔ بس" ڈاکٹر کی آنکھیں چمک گئیں۔

"اوہ اب سمجھا۔ معاف کرنا بھائی میں —— خیر رہنے دو —— چلو میرے ساتھ کلینک سے دوائی لے آؤ ——"

توقیر نے جیب سے پندرہ روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیتے۔

"آپ کی فیس ——"

ڈاکٹر نے فاتحانہ اس کا جائزہ لیا اور کسی قدر تجسس سے پوچھا۔

"تمہاری کتابیں کہاں ہیں؟"

توقیر کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"وہ تو میں نے ——" پر اس نے اپنی زبان روک لی۔

ڈاکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بازار بیچ دی ہیں نا ——"

توقیر نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

ڈاکٹر نے روپے اس کے ہاتھ سے لے کر اس کی جیب میں ڈال دیئے۔

"کسی شریف باپ کا خون ہو۔ اگر سبھی طالب علم ایسے ہو جائیں تو شاید قوم کی حالت سدھر ہی جائے ——"

توقیر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ——"

آؤ میرے ساتھ دوائی لے آؤ۔ دونوں ایک ساتھ باہر نکل گئے۔

لائنیں عبور کر کے جب وہ سڑک پر آئے تو ڈاکٹر بڑی شفقت سے بولا۔

"کون سی دکان پر بیچی تھیں کتابیں ؟ ——"

"چھوڑیئے ان باتوں کو۔" توقیر شاید اس موضوع پر کچھ نہ کہنا چاہتا تھا۔

"بھائی اپنے ساتھ ایسا ڈھیچ نہیں چلے گا۔ یہ تو تمہیں بتانا ہی ہو گا ——"

"خواہ مخواہ ہی ——"

"بالکل میں کہلوائے بغیر نہ چھوڑوں گا۔" ڈاکٹر کھڑا ہو گیا۔

توقیر نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

"چلیئے نا ——"

"جب تک بتاؤ گے نہیں۔ میں تو ہلنے کا نہیں۔"

توقیر تھوڑی دیر کھڑا سوچتا رہا۔

"اچھا چلیئے بتاتا ہوں۔" وہ مان ہی گیا۔

دونوں کتابوں کی دوکان پر پہنچے۔ توقیر نے اپنے پاس سے رقم دے کر کتابیں واپس لینے کی کوشش کی۔ پر ڈاکٹر نے ضد اور اصرار کر کے خود قیمت ادا کی اور اس کی کتابیں لے دیں۔

کلینک کی طرف جاتے ہوئے ڈاکٹر پھر مخاطب ہوا۔

"تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں ——"

"توقیر" بغل میں اپنی کتابیں درست کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"میرا نام کامران ہے۔ تم سے مل کر اتنی خوشی ہوئی کہ شاید الفاظ میں بیان نہ کر سکوں۔ اب ملتے رہو گے نا ——"

"کوشش کروں گا ——"

"رہتے کہاں ہو ——"

"دولت نگر ——"

"بھائی اس محلے کا تو ایک مصوّر بھی ہے۔ نام اس کا بھی توقیر ہی ہے ——"

"میں ہی ہوں ——"

"بھئی خوب پڑھائی کے ساتھ مصوّری میں بھی اس قدر کمال۔ قابل داد ہو میاں۔"

توقیر خاموش رہا۔

"کہاں پڑھتے ہو ——"

"گورنمنٹ کالج ——"

کلینک آگیا تھا اس لیے کامران خاموش ہوگیا۔ توقیر اس کے ساتھ اندر
گیا جلدی جلدی دوائیاں لیں اور واپس چلا آیا۔

توقیر جمیلہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اسی طرح بے سدھ سی پڑی تھی۔
کنول اس کے پلنگ کی پٹی پر بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔ اس نے دوائیاں
قریب ہی چھوٹے میز پر رکھ دیں اور جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دوائی پی لیجئے۔"

جمیلہ نے اٹھنے کی کوشش کی۔ توقیر نے اسے سہارا دے کر بٹھایا پھر
کنول کی طرف دیکھا۔

"تھوڑا سا پانی لے آیئے ——"

کنول گلاس میں پانی لے آئی۔ توقیر نے جمیلہ کو دوا پلائی اور اسی طرح لٹا
دیا۔ پھر بڑی ملائمت سے کہا۔

"میں اب چلتا ہوں ——"

جمیلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"چلے ہی جاؤ گے بیٹا! بیٹھو کچھ دیر ——"

توقیر بیٹھ گیا۔

"خوش بخت ہیں وہ ماں باپ جن کے تم بیٹے ہو۔ تمہاری آج کی مدد
عمر بھر نہ بھول سکوں گی۔ آج کون کسی کے کام آتا ہے۔"

توقیر نے ہمدردی سے کہا۔

"یہ تو میری سعادت مندی کا تقاضا تھا۔"

جمیلہ خاموش رہی۔

توقیر کو اس کی حالت دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔

"آپ کا کوئی بیٹا نہیں ہے؟"

جمیلہ سن سی ہوگئی چہرے کا رنگ سرسوں کی طرح پیلا پڑ گیا۔

توقیر اس کی حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ فوراً معذرت چاہی۔

"میرے سوال کا شاید آپ برا مان گئیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

جمیلہ کی آواز گھگھیا گئی۔

تمہارے سوال کا کیوں برا ماننے لگی بیٹا! مجھ بدنصیب کو اپنا بیٹا ہوا زماں
یاد آگیا۔ کئی برس پہلے ہمارا گھر پریم نگر میں تھا۔ ایک بیٹا تھا۔ تنویر اس کا
نام تھا۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ ہمک ہمک کر میری گود میں آیا کرتا تھا۔ ایک بیٹی تھی
پروین خوبصورت اور سلیقہ شعار اور ایک محبت کرنے والا شوہر تھا۔ زندگی خوب
گزر رہی تھی۔ خوش حال چھوٹا سا گھرانہ تھا پر بے رحم زمانہ یہ دیکھ نہ سکا اور
سب میں جدائی کا تیر کھینچ مارا۔ پروین ایک روز تنویر کو کھلانے باہر گئی تھی کہ
پھر واپس نہ آئی۔ کوئی اسے اغوا کر کے لے گیا۔ تنویر کو بھی ساتھ ہی لے گئے
پروین کو انہوں نے اپنے پاس رکھ لیا۔ پر تنویر کو پتہ نہیں کہاں ڈال دیا۔ بیٹی
بیٹے کے کھو جانے پر ہم میاں بیوی پاگل ہوگئے۔ بہت ڈھونڈیا کی۔ ان کے
ابا بھی دن بھر ان کی تلاش میں رہتے مگر ان کا کہیں کھوج نہ ملا۔

جمیلہ رکی ایک لمبا سانس لیا اور پھر کہنے لگی۔
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہوگئی ہم شہر چھوڑ کر یہاں آگئے اپنا وہ مکا
بیچ ڈالا اور یہیں رہنے لگے۔ یہ میری ماں کا گھر ہے۔ میں ان کی اکلوتی لڑکی
وہ بھی فوت ہوگئی ہیں۔ سفر کے دوران گاڑی میں ہمیں کسی کی گم شدہ بچی م
میں نے اسے پال لیا اور کنول نام رکھا اب پندرہ برس ہونے کو ہیں لیک
کنول جو قریب بیٹھی رو رہی تھی اور زیادہ بے تاب ہوگئی اور جمیلہ
منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
"بس کریں امی کیوں اپنا دل دکھاتی ہیں۔ مقدر میں جو کچھ تھا مل گیا کہ
سسکیاں لے کر رونے لگی۔ جمیلہ بھی پھکو پھکو رو دی توقیر کی آنکھ
سے آنسو بہہ نکلے۔ کنول کو جانے کیا ہوا۔ برداشت کے سارے بندھ
جمیلہ کے سینے پر سر رکھ کر دھاروں دھار رونے لگی۔ جمیلہ نے اپنے آ
سنبھالا اور کنول کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
"نہ رو بیٹی! میرا تو سب کچھ تمہیں ہو۔ بیٹا بھی ہو۔ بیٹی بھی ہو اور
سکھ کا ساتھ بھی۔"
کنول نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔
"پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟"
توقیر ان کی باتیں سن سن کر چپ بیٹھا روتا رہا۔
جمیلہ نے کنول کے گورے چٹے سرخ گداز گال کا بوسہ لے لیا

"اچھا پھر نہیں کہوں گی۔"
کنول کے آنسو اس نے اپنے ململ کے دوپٹے سے پونچھے اور اس کے
سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔
دونوں ماں بیٹی سنبھل گئیں۔
توقیر نے رومال سے اپنی آنکھیں خشک کر لیں۔
"بیٹی کتنی دیر سے یوں بیٹھا ہے توقیر! چائے ہی بنا لاؤ۔" جمیلہ نے کنول
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
توقیر فوراً بول پڑا۔
"رہنے دیں ماں جی! کیا ضرورت ہے اب چلتا ہوں۔"
"بیٹھو بیٹا۔ چائے پی کے چلے جانا۔"
کنول اٹھ کر باہر نکل گئی۔
توقیر نے ایک لمبا سانس لیا اور دکھ سے کہا۔
"کاش! آپ کا بیٹا اور بیٹی مل جائے۔"
"بیٹے کے ملنے کی تو سبھی امیدیں ختم ہو چکی ہیں۔ اس کے غم نے تو مجھے
وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ مرنے سے پہلے ایک بار
اس کی شکل دیکھ لوں اور اطمینان ہو جائے کہ وہ زندہ ہے اور خوش ہے اس
کے بغیر جینے کی کوئی آرزو نہیں۔ بس تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔ بڑا ہو کر
مالکا، تم جیسا ہوا ہوگا۔"

توقیر نے کچھ بیتابی سے پوچھا۔

" تو اس کا مطلب ہے آپ کی بیٹی مل گئی۔"

" ہاں مل گئی۔ لیکن بے رحم زمانے اور وقت کے نامساعد تھپیڑوں نے اسے اس جگہ پہنچا دیا۔ جہاں وہ ماں کو ماں، باپ کو باپ اور بھائی کو بھائی کہہ کر نہیں پکار سکتی۔ جہاں عورت عورت نہیں طوائف اور رنڈی کہلاتی ہے۔ ظالموں نے میری پھول سی بیٹی کو ہر ایک کے سامنے رقص کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

توقیر نے کانوں میں انگلیاں دے دیں۔

" اُف میرے خدا اتنا بڑا ظلم ———"

" میرے ساتھ [illegible] ہے۔"

" پروین آتی ہے کیا کنول آپ کے پاس؟ ———"

" آتی ہے۔ گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر میری حالت پہ رو دھو کے چلی جاتی ہے۔ سوچتی ہوں کاش! میں پیدا ہی نہیں ہوتی اور وقت کی ان ستم ظریفی کا تختۂ مشق تو نہ بنتی پھر بھی اللہ کا شکر ہی کرتی ہوں کہ جی رہی ہوں اور کسی کی محتاج نہیں۔ شادی سے پہلے ہی میں کالج میں لیکچرار تھی۔ چند ہی برس ہوئے ہیں۔ ریٹائرڈ ہوئی ہوں۔ پنشن اتنی مل جاتی ہے کہ کنول کی پڑھائی کے خرچے کے علاوہ دونوں ماں بیٹی کا گذارہ بھی اچھا ہی ہو رہا ہے ———"

توقیر نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

" کون سی کلاس پڑھتی ہے۔ کنول!؟"

" ڈاکٹری کے تیسرے سال میں ہے ———"

" آپ کے شوہر کیا؟"

" وہ اس شہر میں آکر کچھ عرصہ زیادہ رہے اور بیٹے بیٹی کے غم میں ہی چل بسے۔ تم نے اپنا تو بتایا ہی نہیں کہاں رہتے ہو کیا پڑھتے ہو ———"

" دولت نگر رہتا ہوں اور بی اے آخری سال میں ہوں ———"

" خدا تمہیں کامیاب کرے ———"

اتنے میں کنول چائے کی دو پیالیاں اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ توقیر نے اس کی طرف دیکھا۔

اُف

جیسے پورن ماشی چاندنی فضاؤں میں بکھر گئی ہو۔ وہ آگے بڑھی کچھ جھجکی پھر ایک پیالی جمیلہ کے سامنے میز پر رکھنے کے بعد دوسری پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ فضا میں ایک آواز بلند ہوئی کچھ اس طرح جیسے بلندی سے گرتی ہوئی آبشار کے شفاف نیلے پانی کی نغمگی ماحول میں رچ بس گئی ہو۔

یا

پھر خوش کن آواز کے ساتھ سینکڑوں جھرنے پھوٹ نکلے ہوں۔

لیجئے۔

اس کے خوبصورت سرخ سرخ گزار ہاتھ کانپ رہے تھے۔ توقیر نے ایک

بار غور سے اس کی طرف دیکھا پھر نگاہیں جھکا کر پیالی اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ایک بار پھر کنول کی روح نواز آواز بلند ہوئی۔

جیسے
کسی کی جھانجھر کا گھنگھرو چھٹک گیا ہو۔

"پانی پیئیں گے ——"

توقیر نے دھیرے سے کہا۔

"جی ——"

صاف ستھرے اور شفاف شیشے کے گلاس میں کنول نے اسے پانی پلایا چائے کے اس نے ابھی دو چار گھونٹ ہی پیے تھے کہ ایک لڑکی اندر داخل ہوئی ہلکے گلابی رنگ کی ریشمی شلوار کے اوپر وہ سیاہ برقعہ پہنے ہوئے تھی۔ توقیر نے ایک بار اسے دیکھا پھر اسی طرح چائے پینے لگا۔ لڑکی نے چہرے سے ابھی تک نقاب نہیں اٹھایا تھا۔

کنول اسے دیکھتے ہی اُٹھی اور پروین باجی کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ توقیر سمجھ گیا کہ جمیلہ کی بیٹی ہے۔ کنول کو وہ ساتھ لے کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جمیلہ پُرشوق نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

توقیر چائے پی چکا۔ اتنی دیر میں ساتھ والے کمرے سے آواز سنائی دی۔

"کون ہے یہ؟ پروین کی آواز آئی۔"

کنول نے دھیرے سے کہا۔

"امی ڈاکٹر کے پاس جاتی ہوئی، ریل کی لائنوں میں گر پڑی تھیں۔ یہ ان کو اٹھا کر لایا تھا اور پھر ڈاکٹر کو بلا کر دکھانے کے بعد ابھی دوائی لے کر آیا ہے۔ کوئی اچھا لڑکا دکھائی دیتا ہے باجی!"

"خدا بھلے کرے اس کا" پروین بولی۔

کنول نے کچھ نہ کہا۔

پروین پھر بولی۔

"کیا نام ہے اس کا؟ ——"

"بھلا سا نام ہے —— وہ —— یاد ہی نہیں پڑ رہا —— ارے ہاں —— توقیر ہے —— توقیر ——"

پروین چپ ہو کر اداس ہو گئی۔

کنول نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔

"کیا سوچنے لگیں باجی! ——"

وہ چونک گئی۔

"کچھ نہیں۔ یوں دکھائی پڑتا ہے۔ جیسے یہ میرا بھائی تنویر ہو۔ جوان ہو کر وہ بھی اسی جیسا لمبا سا اور خوبصورت ہو گیا ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے وہ ضرور زندہ ہے لیکن پتہ نہیں کہاں ٹھوکریں کھا رہا ہوگا ——"

کاش! میں اس منحوس دن اسے باہر لے کر نہ جاتی اور ہم سب میں یہ لکیر نہ کھینچ جاتی۔ ابو مر گئے۔ امی کو غم اور دکھ کی بیماریوں نے گھیر لیا۔ تنویر کھو

گیا - اور میں ———

میں اس جگہ پہنچا دی گئی - جہاں عورت ماں ، بہن اور بیوی کے نام
نہیں رنڈی اور طوائف کہہ کر پکاری جاتی ہے - اس گلی میں ماں کو میں ما
نہیں پکار سکتی - بھائی ہو تو اسے بھائی نہیں کہہ سکتی - جہاں ہر وقت آوا
شرابی اور بدکار مردوں کی سرخ سرخ جذباتی اور حریص نگاہیں مجھے گھورتی
رہتی ہیں - گرہستن عورتیں ہم پر تھوکتی ہیں - جیسے ہم اچھوت ہوں اور م

——— اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے -

ہمیں
جسم فروش
عصمت فروش
طوائف
رنڈی
پتریا
کسبی
فاحشہ

اور بیسوا کہتے ہیں - آخر ایک ہی عورت کے اتنے نام کیوں ! بے
زمانے نے میرے ساتھ ظلم کیا ہے وہ سسک پڑی اور پھر چپکے چپکے رو دی -
توقیر کی حالت بھی غیر ہوتی جا رہی تھی - اس کی آنکھیں بھیگ گئیں ۔

کے سامنے لیٹی ہوئی جمیلہ بھی چپکے چپکے رو رہی تھی -

کنول اور پروین اندر رو رہی تھیں -

جمیلہ ہونٹ بھینچ کر سسک دی -

توقیر بیچارا خاموشی سے سب کچھ دیکھتا اور سنتا رہا اور دل ہی دل رویا

کیا اتنے میں کنول کی آواز سنائی دی -

تمہارا اس میں کیا دوش اور جرم ہے باجی ! قصور تو ان مردوں کا ہے -
جنہوں نے تمہیں اغوا کر کے اس جہنم میں دھکیل دیا ہے - جب مرد اس قدر
ذلیل اور بدترین کام کر گزرتے ہیں تو پھر کس منہ سے کہا جاتا ہے کہ

مرد افضل ہے -
عورت پر فائق ہے -
اور درجے میں اس سے بلند -

کنول نے چھنی ہوئی آواز میں کہا -

مرد آوارہ ہو
شرابی
بدکار

اور فاحش ہو - اس کی سب باتیں چھپ جاتی ہیں - گویا کوئی بات
ہی نہ ہوئی ہو - اور عورت اگر ایسی ہو تو طوائف اور رنڈی کہلائے اس کے
نام پر تھوکا جائے اور مرد جو اس کے ہم گناہ ہوتے ہیں وہ ایسے القاب سے

میرا ہوں کیا اسلامی مساوات کا اصول یہی ہمیں سکھاتا ہے۔

کہ مرد ظلم کرے اور عورت چپ رہے۔

مرد اسے گناہ کی بھٹی میں دھکیل دے اور وہ آمنا وصدقنا کہہ کر
خاموش ہو جائے۔

مرد اسے بھیڑ بکری کی طرح گناہ کے جس مرضی چاہے راستے پر ہانکتا ہے
اور اس کے لب فریاد کے لیے نہ کھلیں۔

کیوں ؟

آخر کس لیے ؟

کیا طوائفوں اور رنڈیوں سے کبھی کسی نے یہ بھی پوچھا ہے۔

تم اس بازار کیوں آئیں ؟

کیا بپتا بیتی تم پر ؟

اپنی مرضی سے یہاں ہو۔ یا زبردستی کس [illegible] ر رہا ہے تمہیں۔

کیا کسی نے کبھی اس بازار سے تنگ، بے بس اور مجبور عورتوں کو وہاں سے
چھٹکارا دلایا ہے۔

پروین نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔

"یہ تو تمہارے اپنے خیالات ہیں۔ کنول ان سے کیوں متفق ہونے لگے۔"

توقیر سب کچھ سنتا رہا۔

اتنے میں جمیلہ بول پڑی۔

"پاگل ہو گئی ہے یہ لڑکی! بیٹھے میں خبر نہیں کیا کچھ کہتی جا رہی ہے۔"

توقیر کو بھی بولنا پڑا۔

"وہ ٹھیک کہہ رہی ہے! مرد اس معاملے میں واقعی خطاکار ہیں۔ وہ اگر ایسے
پنچ اور انسانیت سوز کام نہ کریں۔ تو ——"

تو اس بازار کے کوٹھے کیوں آباد رہیں۔

شریف گھرانوں کی معصوم، بے داغ اور باحیا لڑکیاں وہاں پہنچ کر سماج کے
لیے کیوں رستا ہوا ناسور بنیں۔ سب خطا ان۔

بے حیا۔

بے شرم۔

اور بے غیرت مردوں کی ہے، جو کئی گھرانوں کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔

اور ان کے اس گھناؤنے کام کے باعث۔

بیٹی باپ سے۔

بہن بھائی سے۔

اور بیوی شوہر سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر تاریکی کی غاروں میں کھو جاتی
ہے۔ نہ وہ گھر کی رہتی ہے نہ گھاٹ کی۔ بس ساری عمر گیلی لکڑی کی طرح اپنے
گناہوں میں سلگتی رہتی ہے۔ یہ سب ذمہ داری ان مردوں کی ہے۔

جن کی عورت کو ماں بہن اور بیٹی سمجھنے کی حس ختم ہو چکی ہوتی ہے۔

جو عورت کو کھلونا سمجھ کر ہر ایک کا دل بہلانے کے لیے اسے جگہ جگہ پھینکتے

پھرتے ہیں۔

مرد اس معاملے میں واقعی ظالم اور عورت مظلوم ہے۔ لیکن نہیں دیکھا جائے تو غلطی ان عورتوں کی بھی جو کسی غیر مرد کے منہ سے محبت کے دو ہی بول سن کر اپنا گھر بار حتیٰ کہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ نکل کھڑی ہوتی ہیں!

کنول اور پروین خاموشی سے سنتی رہیں۔

جمیلہ بھی ٹکٹکی باندھے رہی۔

توقیر کہتا رہا۔

خدا ایسے مردوں کو ہدایت دے اور ایسی عورتوں کو سنبھلنے کی توفیق

جمیلہ نے اسے ٹوکا۔

" چھوڑو بیٹا! اس موضوع کو۔ پروین نے کون سا ذکر چھیڑ دیا ہے ——"

توقیر خاموش ہو گیا۔

جمیلہ نے نیچی اور نرم آواز میں پکارا۔

"کنول ——"

کنول اندر داخل ہوئی۔

"جی امی جان! ——"

" بیٹی! توقیر کو اس کی کتابوں اور دوائیوں کے پیسے دو ——"

کنول واپس مڑ گئی۔ توقیر نے فوراً دخل اندازی کی۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں۔ آپ ماں جی! کتابیں تو میرے پاس ہیں اور د

اکٹر نے مفت دی ہیں ——"

وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

" میں اب چلتا ہوں۔"

کنول پھر اندر آئی۔

لیکن وہ اُٹھ کر باہر جا رہا تھا۔

جمیلہ نے ایک بار اسے پکارا۔

" ذرا ٹھہر جاؤ بیٹا! ——"

" جی نہیں اب چلتا ہوں ——"

" پھر آیا کرو گے ——"

" کوشش تو ضرور کروں گا۔"

توقیر باہر نکل گیا۔

کنول اور پروین جمیلہ کے پاس آ کر بیٹھ گئیں ——

کوئی ایک گھڑی دن باقی تھا۔ توقیر گھر داخل، سامنے برآمدے میں لکڑ
چوکی پر اس کی ماں ساجدہ نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہی تھی۔ اس سے
کے ذرا دائیں طرف اس کا بھائی کسی موٹی سی کتاب میں غرق تھا۔ قریب
کی بیوی فریدہ نائٹنگ کا سامان پھیلائے بیٹھی تھی۔

توقیر کسی سے کچھ کہے بغیر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ ایک کونے میں چھ
سے سکرین پر مختلف رنگوں میں کچھ ادھوری اور نامکمل سی تصویر بنی تھی پس
میں لمبے لمبے ٹنڈ منڈ درخت ہوا کے تیز جھونکوں میں ادھر اُدھر جا رہے
پیش منظر میں بجھی ہوئی شمع سے دھواں اُٹھ رہا تھا جس کے قریب ایک
حسین لڑکی بیٹھی چھم چھم رو رہی تھی۔

"ٹرین کے قریب ہی مختلف رنگوں کے چھوٹے چھوٹے ڈبے اور چند برش
پڑے تھے۔ کمرے کے دوسری طرف لکڑی کے پلنگ پر صاف ستھرا بستر۔ ساتھ
ہی میز پر ترتیب سے پڑی چند کتابیں، پلنگ کے ساتھ والے کونے میں کپڑوں
کی چھوٹی سی الماری جس کے اوپر ایک خوبصورت وائلن اور میز کے پاس دو کرسیاں
پڑی تھیں۔

توقیر نے ابھی میز پر کتابیں رکھی ہی تھیں کہ اس کی چھوٹی بہن شہناز اندر داخل
ہوئی۔

"کہاں رہے بھیّا! اتنی دیر تک" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

توقیر جو جمیلہ کے حالات سن کر ابھی تک اداس تھا۔ زبردستی مسکرا دیا۔

"کہیں نہیں۔"

وہ اسے بازو سے پکڑ کر باہر لائی۔

"چلئے کھانا کھائیے۔"

دونوں جب باہر برآمدے میں آئے تو ساجدہ دعا سے فارغ ہو چکی تھی۔ توقیر
کو دیکھتے ہی پوچھ لیا۔

"اتنی دیر سے کیوں آئے ہو بیٹا؟"

توقیر جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ نائٹنگ کرتی ہوئی فریدہ بول پڑی۔

"آوارہ گردی کرتا رہا ہوگا اور کیا کرنا ہے اس نے ——"

توقیر ہونٹ کاٹ کے رہ گیا۔ پر صبر کر گیا اور ساجدہ کی طرف دیکھتے ہوئے

تحمل سے کہا۔

" بس یونہی ذرا دیر ہو گئی ماں ! "

اور یہ تمہارے کپڑوں پر کیچڑ بھی تو لگی ہے۔

فریدہ پھر بول پڑی۔

" جھگڑا کیا ہو گا کسی سے اور اس سے امید بھی کیا ہو سکتی ہے۔"

توقیر نے خشمگیں نگاہوں سے فریدہ کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے
ہی تھا کہ ساجدہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بازو سے پکڑ کر ا
اس کے کمرے میں لے گئی۔ توقیر نے منہ سے ماں کا ہاتھ ہٹا دیا۔

" ماں ! بھابی کو آپ نے سر چڑھا رکھا ہے جو منہ میں آتا ہے کہہ جاتی ہ
ہم اس کے دبیل تھوڑے ہی ہیں۔ بھائی جان پاس اس طرح چپ بیٹھے ہیں
ہم سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔ وکیل کیا بن گئے گویا ہمارے حاکم مقرر ہو گئے ہیں۔"

ساجدہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

وہ تو موئی بے تکی ہے، تو ہی چپ کر۔

توقیر نے غصے میں کہا۔

" میں چپ رہوں اور اس کی گھرکیاں سنتا رہوں۔"

ساجدہ کی آواز گھگھیا گئی۔

" مجبوری ہے بیٹا ! تم سمجھتے کیوں نہیں۔ وحید ایسی باتوں میں بالکل دخل
نہیں ہوتا۔ اسے فریدہ پر بھروسہ ہے۔ جب اپنا بیٹا ہی پہلا سا نہ رہا تو پرا

کیا وہ تو ہمارے اس گھر میں رہنا بھی بوجھ سمجھتی ہے۔"

توقیر بپھر گیا۔

" گھر ہمارا ہے اس کے باپ کا نہیں ———" اسی لمحہ فریدہ کا بھائی زاہد
رونی دروازے سے اندر داخل ہوا توقیر اسے دیکھ کر اور زیادہ خفگی سے بولا۔

" اس نواب صاحب کو دیکھو ماں ! مجھ سے بھی دیر میں کالج سے لوٹ رہا ہے۔
ے کسی نے نہیں کہا کہ کہاں آوارہ گردی کرتے رہتے ہو۔ ساری باز پرس مجھ سے ہوتی
ے۔ ایک تو بھائی جان کے خرچہ پر ڈاکٹری پڑھ رہا ہو اور اس پر یہ ٹھاٹھ۔ مجھے بھائی
ان نے آرٹس میں ڈال دیا ہے۔ جیسے میں گھر کا ملازم ہوں میرے لیے اس سے
ر کوئی لائن نہ تھی۔ بی اے کر بھی گیا تو بھی کیا ملے گا؟ ڈیڑھ سو روپے کی کلرکی! وہ
ی آج کل کوئی نہیں دیتا۔ زاہد جتنا خرچہ مانگتا ہے بھابی اسی وقت نکال دیتی ہیں۔
ے کسی نے کبھی پھوٹی کوڑی نہیں دی۔ اپنی تصویریں بیچ کر اکا دکا کتاب بھی لے
تا ہوں اور اپنا خرچہ بھی چلاتا ہوں۔ ماں ! تم خود ہی بتاؤ۔ یہ بے انصافی نہیں،
کیا ہے ؟ ———"

ساجدہ اداس ہو گئی۔ توقیر کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ بس ٹال گئی۔

" چھوڑو ان باتوں کو۔ چلو کھانا کھاؤ ———"

" نہیں ماں ! بھوک نہیں۔ اب شام کو ہی کھاؤں گا ———"

ساجدہ خاموش رہی۔ قریب کھڑی شہناز نے اس دفعہ کہا۔

آپ بیٹھئے پھر بھائی جان۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ اتنی دیر

تک آپ کپڑے بدل لیں پھر میں آپ کی قمیض دھو دیتی ہوں۔ دیکھیں تو کتنی
کیچڑ لگ رہی ہے۔

کپڑے بدل کے توقیر نے کرسی کھینچی اور ادھوری تصویر کو مختلف رنگوں کی آ
دے کر مکمل کرنے لگا۔ شہناز اس درمیان چائے لائی اور توقیر کو معروف دیکھ کر
اس کے پاس رکھنے کے بعد خاموشی سے باہر نکل گئی۔

شام تک اس کا برش قسم قسم کے رنگوں سے سکرین پر کھیلتا رہا۔ آخر تصویر
مکمل ہو گئی۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ کرسی سے اُٹھ کر چند ساعتیں تصویر کو
گھورا۔ ہونٹوں پر اطمینان آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر پیچھے ہٹا۔ کپڑوں کی الما
پر سے وائلن اٹھا کرے کی طرف کھلی کھڑکی کے پاس آکر ہلکے ہلکے سروں میں بجا

تنہا تھی اور ہمیشہ سے تنہا ہے زندگی

کافی دیر تک وہ بجاتا رہا۔

آواز گہری ہونے لگی۔

سروں میں سوز آتا چلا گیا۔

بجاتا رہا وہ گم سم

مدہوش سا

گردوپیش سے بے خبر

سروں کی جاذبیت آمیز لہروں میں بہتا رہا۔

آخر اس کا ہاتھ رک گیا وائلن اس نے پھر وہیں رکھ دیا۔ تصویر کے پاس آ

دو چار منٹ تک اسے گھورا پھر اس پر پردہ ڈالنے کے بعد وہ برآمدے میں آگیا۔ شام
گہری ہو چلی تھی۔ فضا میں ہر سو دھواں ہی دھواں تھا۔

گھروں کے باورچی خانوں کا۔

ہوٹلوں اور بسوں کا۔

فیکٹریوں اور تنوروں کا۔

دھواں ہی دھواں تھا۔

ہر سو۔

وہ کھو سا گیا فضا میں۔

گھر میں سکوت تھا۔

گہرا اداس سکوت۔

باہر سڑک کنارے پانی کے کھڈوں میں مینڈک ــــ" راگ الاپ رہے
تھے۔ آسمان پر ابھی تک ساون کے سیاہ گہرے بادل تیر رہے تھے۔ اس نے باہر
صحن میں آنا چاہا کہ برآمدے میں ایک طرف شہناز آتی دکھائی دی۔

"کھانا کھا لیجئے بھائی جان! ــــ"

توقیر چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

دوسرے روز توقیر اپنے دوست اور کلاس فیلو مسعود کے ساتھ کالج سے گھر
لوٹ رہا تھا کہ بازار میں ایک کار ان کے قریب آکر رکی۔ کسی نے ہارن دے کر انہیں
اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی توقیر نے جو ادھر دیکھا، تو ڈاکٹر کامران تھا۔ اس

کے ساتھ ایک اور خوبصورت سا نوجوان تھا، جو کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ کامران نے کار کا پچھ
دروازہ کھول کر توقیر کی طرف دیکھا۔

"آؤ بیٹھو ؟ ——"

"کہاں جائیں گے ۔" توقیر نے پوچھا۔

کامران نے بے تکلفی سے کہا۔

"بھئی پہلے بیٹھو تو ۔ یہ بعد میں بتاؤں گا ۔"

توقیر نے مسعود کی طرف دیکھا۔

"میں چلتا ہوں ۔" مسعود نے کہا۔

توقیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

" ابے آؤ بیٹھو اکٹھے چلیں گے ——"

دونوں پچھلی تنہا تھی بیٹھ گئے ۔ کار کے اندر ہی سب کا تعارف ہو گیا۔
کا ساتھی جس کا نام قیصر تھا۔ توقیر سے کافی متاثر دکھائی دیتا تھا۔ کار ڈرائیو کرنے
ساتھ ساتھ وہ اس پر سوال بھی کرتا جا رہا تھا۔

"کہاں رہتے ہو ؟ ——"

"تصویریں کیسے بناتے ہو ؟ ——"

"خالی وقت میں کیا کرتے رہتے ہو ——"

توقیر اپنی مخصوص سریلی آواز میں دھیرے دھیرے جواب دیتا جا رہا تھا۔
کے ساتھ ایک ہوٹل کے سامنے رک گئی ۔ چاروں آگے پیچھے اندر داخل ہو

خالی میز کے گرد بیٹھ گئے بیرا آیا اور قیصر نے کھانے کا ایک خاصا طویل اور عریض
آرڈر دے ڈالا۔ بیرا چلا گیا تو توقیر نے پہلی بار قیصر کو مخاطب کرنے میں پہلی کی۔

"آج کل آپ کیا کر رہے ہیں ؟ ——"

قیصر نے بڑی توجہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"فی الحال تو ایم ۔ بی ۔ ایس کے بعد ہاؤس جاب کر رہا ہوں"

"اس کے بعد ؟ ——"

"ایف آر سی ایس کا ارادہ ہے ——"

"فارن جائیں گے ——"

"جی ۔ ایسا ہی کچھ خیال ہے ۔ دیکھیں ہوتا کیا ہے ——"

"لگن سچی ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے ۔"

"آپ کا کیا ارادہ ہے ۔ گریجوکیشن کے بعد ——"

توقیر نے طنزیہ کہا۔

گریجویٹ کا مستقبل ہی کیا ہے ۔ قسمت نے اگر کہیں ساتھ دیا اور سفارش
بھی ہو تو کہیں کسی پوسٹ پہ اٹک ہی جاتا ہے ۔ ورنہ وہی کلرکی ۔ وہ بھی کبھی نہیں
ملتی ۔ ہاں اتنا فائدہ ضرور ہے کہ پڑھے لکھوں میں نام ہو جاتا ہے اور ہاں سنا ہے جیل
جاؤ تو کلاس بی بھی مل جاتی ہے ۔"

قیصر، کامران اور مسعود تینوں ہنس دیئے۔

کھانے کے بعد چاروں باہر آئے ۔ توقیر اور قیصر پیچھے بیٹھ گیا۔ کامران کار ڈرائیو

کرنے لگا اور مسعود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کار چلتی رہی، مختلف سڑکوں پر ادھر اُدھر قیصر کو جانے کیا سوجھی۔ توقیر کے کان کے قریب منہ لے جاکر سرگوشی کی۔

"میری سسٹر تمہاری تصویریں بہت پسند کرتی ہے۔ ایک اچھی سی تصویر بنا دو۔ بس ماسٹر پیس قسم کی ہو"

توقیر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پر منہ سے کچھ نہ کہا۔

قیصر نے پھر کہا۔

"بنا دو گے نا! ــــ"

"ہاں!" بھولے پن سے توقیر نے کہا۔

قیصر نے پھر سرگوشی کی۔

کامران نے مجھے تمہارے متعلق بہت کچھ بتا دیا ہے۔ تمہارے گھر کا بھی مجھے پتہ چل گیا ہے۔ اب میں خود ہی تمہیں ملنے آجایا کروں گا۔ ملو گے نا!"

"کیوں نہیں ملوں گا۔"

"میرے ہاں کب آؤ گے؟"

"جب بلاؤ گے۔"

"ابھی چلو۔"

"تمہارے گھر والے خفا ہوں گے۔ کس کو پکڑ لایا۔"

"گھر پر ہے ہی کوئی نہیں۔ خفا کون ہوگا۔ میں ہوں، چھوٹی بہن اور دو بوڑھی

ملازمائیں۔ جن میں سے ایک دن کو کام کر کے گھر چلی جاتی ہے اور دوسری دن رات ہمارے پاس رہتی ہے۔ اب بولو؟ ــــ"

"چلو گے نا ــــ"

"ضرور چلوں گا۔ لیکن اب نہیں۔ پھر کبھی۔"

"تمہاری مرضی۔"

ریل کا پل آگیا تھا۔ توقیر نے کامران کا شانہ پکڑ کر کہا۔

"کامران بھائی ہمیں یہیں ڈراپ کر دو ــــ"

"کیوں! چلو گھر چھوڑ کے آتا ہوں۔"

"نہیں بھائی جان! اتار دیجئے ہم چلے جائیں گے۔"

کامران نے کار روک لی۔ توقیر اور مسعود نیچے اتر کر پل پر چڑھنے لگے۔ قیصر اور کامران آگے بڑھ گئے۔

اسی دن شام کو توقیر نے اپنی مکمل کی ہوئی تصویریں اٹھائیں اور بازار کی طرف چل دیا۔ بڑے چوک کے پاس جا کر وہ تصویروں کی ایک دکان میں گھس گیا۔ دکان کا مالک اس کا جاننے والا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ توقیر نے تصویر اس کے سامنے رکھ دی وہ اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"بہت اچھی بنائی ہے۔ تمہاری پہلی دو تصویریں ایک لڑکی لے گئی ہے۔ سو روپیہ دے گئی تھی۔ اس نے سو کا نوٹ نکال کر توقیر کو تھما دیا اور وہاں وہ تم سے ملنا بھی چاہتی تھی۔"

توقیر سے سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں صاحب! میں ملنے سے رہا۔ غریب آدمی ہوں۔ امیروں کے بکھیڑوں میں پڑنے کی سکت نہیں۔ اب اگر پوچھے تو کہہ دینا وہ دوسرے شہر رہتا ہے تصویریں اپنے کسی آدمی کے ہاتھ بھجوا دیتا ہے۔"

دوکاندار نے دُکھ سے کہا۔

"تم لوگوں کو ملنے سے گھبراتے کیوں ہو۔"

توقیر نے گہری آواز میں کہا۔

شاکر صاحب! اسی میں میری بہتری ہے تصویریں میں شوق سے نہیں بناتا پیٹ کے تنور میں جلتی ہوئی بھوک کی آگ سے مجبور ہو کر بناتا ہوں۔ زندگی کی گہما گہمی سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں اپنی نہ کوئی منزل ہے نہ مقصد حیات ہے بس پانی کے تیز دھارے کی طرح زندگی بہے جا رہی ہے اور میں اس کا رُخ بدلنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

شاکر چپ ہو گیا۔

توقیر دوکان سے نکل بازار میں آیا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا وہ مختلف دوکانوں کے سامنے سے گزرتا ہوا فٹ پاتھ پر سر جھکائے چلتا جا رہا تھا۔ آخر ایک دوکان کے سامنے وہ رُک گیا اور پھر خبر نہیں کیا سوچتے ہوئے کیا کچھ خرید ڈالا۔

گھی کا ڈبہ

آٹے کی تھیلی

دوسری دوکانوں سے کچھ کپڑا۔

اور چند چھوٹی چھوٹی چیزیں۔

سڑک پر ایک رکشا جا رہا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے توقیر نے اسے روکا۔ سارا سامان اس میں رکھا اور ریلوے کالونی کی طرف چلنے کو کہا۔ رکشہ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی سڑکوں پر بھٹکتا رہا۔ پھر جمیلہ کے مکان کے پاس آ کر رُکا۔ توقیر نے سارا سامان نیچے اتارا اور رکشہ والے کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ مکان کے پاس کھڑے ہو کر چند ساعتوں تک اس نے کچھ سوچا۔ پھر سارا سامان باری باری اٹھا کر دیوار کے اوپر سے جمیلہ کے گھر پھینک دیا اور خود بڑی تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل نکلا۔ ہر سو اندھیرا پھیلنا شروع ہو چکا تھا۔ جمیلہ کے گھر کے سامنے والی سڑک عبور کر کے توقیر ایک گلی میں گھس گیا

چراغ جلے توقیر گھر داخل ہوا۔ شہناز اس کے کمرے میں بیٹھی مطالعہ کر رہی تھی
توقیر کو دیکھتے ہی وہ کھڑی ہوگئی۔

"بہت دیر لگائی بھائی جان!"

"ہاں ایک دوست کے ہاں بیٹھا رہا۔" توقیر نے بڑی بشاشت سے جھوٹ
اور اس کے قریب ہی کرسی پر جم گیا۔ شہناز نے اسے کھانا نکال کر دیا اور وہ چپ
چاپ کھانے لگا۔ بڑے پیارے انداز میں وہ ہلکے ہلکے نوالے توڑنے لگا۔
اس کے سامنے بیٹھ کر محبت آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ بہن جو تھی۔
کھانا وہ کھا چکا تو شہناز برتن سمیٹ کر باہر نکل گئی۔ اتنے میں ساجدہ کمرے
آئی اور توقیر کو دیکھتے ہی کہا۔

"بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں بیٹا!"

"خیریت تو ہے امی جان؟" توقیر نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

ہے تو خیریت ہی۔ کل ہفتہ ہے تم ذرا روپ پور ہو آؤ۔

"ممتاز خالہ کے ہاں؟"

ہاں۔ منزہ کا خط آیا ہے۔ ممتاز سخت بیمار ہے۔ تم کل چلے جاؤ۔ ممتاز اور
منزہ دونوں ماں بیٹی کو لے کر پرسوں اتوار کے روز واپس چلے آنا۔ میرا خیال ہے
ممتاز کو یہاں ہسپتال داخل کرا دیں۔ وہاں دونوں ماں بیٹی ہی تو ہیں۔ نہ آس نہ پاس
ویسے بھی ماں کی بیماری کے باعث منزہ بہت گھبرائی ہوئی ہوگی۔"

"میں انہیں لے تو آؤں گا امی! لیکن یہاں انہیں بھابی کی باتیں سننا پڑیں گی
جنہیں میں برداشت نہ کر سکوں گا۔"

"کچھ نہیں، نہیں ہوگی بیٹا! اسے ان دونوں کا کوئی خرچہ تھوڑا ہی اٹھانا ہے
جو وہ باتیں بنائیں گی ان کی اپنی زمین اور دکانوں کی اتنی آمدنی ہے کہ الٹا وہ ان سب
کا بوجھ بآسانی اٹھا سکتی ہیں۔"

"اچھا امی جان! کل سہ پہر کے بعد چلا جاؤں گا اور پرسوں انہیں ساتھ لے
آؤں گا۔"

ساجدہ مطمئن اور خوش ہوگئی۔

"تم اٹھ کے کپڑے تبدیل کر لو۔ اور تھوڑا پڑھ کے سو رہو۔"

ساجدہ باہر نکل گئی۔

توقیر لباس تبدیل کرنے لگا۔

دوسرے روز کالج سے سیدھا توقیر جمیلہ کے ہاں گیا۔ وہ اسی کمرے میں پلنگ پر لیٹی تھی۔ چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی مدھم مدھم سی چمک اس کی بحالی صحت کا پتہ دے رہے تھے۔ قریب ہی بیٹھی کنول مطالعہ کر رہی تھی۔ میز پر طرح طرح کی دوائیوں کی شیشیوں کے علاوہ ایک آدھ بھرا پانی کا گلاس تھا۔

توقیر جب کمرے میں داخل ہوا۔ کنول میز پر کتاب رکھنے کے بعد کھڑی ہو گئی۔

جمیلہ نے بڑی بشاشت سے کہا۔

"آؤ بیٹا! مجھے امید تھی تم ضرور آؤ گے۔ آؤ بیٹھو! ——"

توقیر ایک کشن کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"آپ کی صحت کیسی ہے؟ ——"

"اچھی ہوں اب تو ——"

"دوا اور تو نہیں منگائی؟ ——"

نہیں وہی کھا رہی ہوں جو تم لے کے دے گئے تھے۔ اچھی دوا ہے طبیعت کافی حد تک سنبھل گئی ہے۔

توقیر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کنول اس کو مخاطب کر کے بول پڑی۔

چائے پئیں گے سکوائش؟

نہ چائے نہ سکوائش۔ کچھ بھی نہیں۔

کنول چپ ہو گئی۔

جمیلہ نے گھرکنے کے انداز میں پوچھا۔

کیوں؟

کیا فائدہ بیکار میں تکلیف اٹھانے کا۔ میں تو ابھی روپ پور جا رہا تھا۔ سوچا باقی دفعہ آپ کی صحت کا پوچھتا جاؤں۔ اب یہ کوئی ضروری تھوڑا ہی ہے۔ جب بھی آپ کی مزاج پرسی کو آؤں آپ ایسے تکلفات نہ کرنے لگیں؟

تکلف کیسا ہے بیٹا! گرمی ہے۔ تمہیں پیاس تو لگ ہی رہی ہو گی۔ جاؤ کنول تم سکوائش بنا لو۔ اس کی باتوں پہ مت جاؤ۔

کنول دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

جمیلہ پھر بولی ——

روپ پور کیوں جا رہے ہو؟

میری خالہ ہیں وہاں۔ وہ بیمار ہیں۔ انہیں لینے جا رہا ہوں۔

"اکیلی ہیں وہاں؟ ——"

"نہیں ان کی ایک لڑکی بھی ہے۔"

"بس؟"

"جی ہاں خالو فوت ہو چکے ہیں اور لڑکا ان کا ہے ہی نہیں۔"

"دونوں ماں بیٹی کا گزارہ کیسے ہوتا ہے؟"

"ان کی جائیداد کافی ہے کچھ دوکانیں بھی کرایہ پر دے رکھی ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ لڑکی ان کی شادی شدہ ہے کیا؟"

"جی نہیں اس نے پچھلے ہی سال گریجوایشن کی ہے۔ ویسے اس کی منگنی میرے ماموں کے لڑکے سے ہو چکی ہے، جو اس کا بھی ماموں زاد ہے۔"

"لڑکا سروس میں ہے؟ ——"

"جی! انجنیئر ہے۔"

"اچھا جوڑ رہے گا پھر تو ——"

کنول دوسرے کمرے سے نکلی اور سکوائش سے بھرا شیشے کا گلاس اس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ توقیر نے جمیلہ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کنول تھ سا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ جمیلہ پھر بولی۔

"ایک بات پوچھوں بیٹا!"

توقیر نے ذرا تجسّس سے اس کی طرف دیکھا۔

"ضرور پوچھیں ——"

"جھوٹ تو نہ کہو گے؟ ——"

"ہرگز نہیں ——"

کنول بھی کچھ پریشانی سے ماں کو دیکھنے لگی۔

جمیلہ نے ذرا سوچ کے کہا۔

"پچھلی رات ہمارے گھر میں کچھ سامان تم نے پھینکا تھا۔"

ذرا دیر کو توقیر کا رنگ بدلا۔ لیکن سنبھل گیا۔

"نہیں مجھے تو خبر نہیں ——"

"جھوٹ۔"

"نہ مانیئے"

"پھر اور تو کوئی ایسا شخص ہی نہیں جو ایسا کرے۔"

توقیر یکسر ہی انجان بن گیا۔

"کیا پھینکا تھا کسی نے؟ ——"

جمیلہ نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"گھی کا ڈبہ، آٹے کی تھیلی، کنول کے لیے کچھ کپڑے اور کچھ چھوٹی چھوٹی سی گھریلو ضروریات کی چیزیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے رات کے پہلے ہی پہر میں کسی نے مشرقی دیوار کے اوپر سے اندر پھینکی ہیں۔ اب میں سوچتی ہوں ان چیزوں کو استعمال میں لاؤں یا نہ۔"

توقیر فوراً بول پڑا۔

آپ کو ضرور انہیں استعمال میں لانا چاہئیے۔ کسی بیچارے نیک آدمی کا کام ہے۔ یوں معلوم پڑتا ہے۔ جیسے وہ آپ کے حالات سے متاثر ہے۔"

جمیلہ نے غور سے اسے دیکھا۔

"کون ہو سکتا ہے!"

توقیر نے بے پروائی سے کہا۔

"خدا بہتر جانتا ہے۔"

جمیلہ خاموش ہو گئی۔

توقیر نے سکوائش کا گلاس اٹھایا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔

ٹرین بھاگتی جا رہی تھی۔
مسافروں سے کھچا کھچ بھری۔
دھول اڑاتی بڑی بے رحمی سے لوہے کی پٹڑی کو روندتی ہوئی ہلکورے
دے رہی تھی نہ آندھی اور طوفان کی پروا، نہ حرارت اور برودت کا خوف۔
بس بھاگتی جا رہی تھی۔
کبھی چٹیل میدانوں میں سے ہوتی۔
گاہے دھان کے کھیتوں سے گذرتی ہوئی۔
بھاگ رہی تھی منزل کی طرف۔
ٹیلی فون کے کھمبے تیزی سے گزر رہے تھے۔

فاصلے اور دوریاں سمٹ رہی تھیں۔
پُل پر سے گزرنے کی گڑگڑاہٹ۔
اور بدلتی لائنوں کی چرچراہٹ منزل کی قربت کا پتہ دے رہے تھے۔ درختوں سے ڈھکے چھوٹے چھوٹے سے سٹیشن آ رہے تھے۔

پر
ٹرین رُکے بغیر ان کا منہ چڑھاتی ہوئی آگے نکل جاتی۔
کانٹے بدل رہے تھے۔
اور
سگنل گرتے جا رہے تھے۔

کوئی بڑا اسٹیشن آگیا تھا شاید۔ اسی لیے ٹرین کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ بریکیں لگنے لگی۔ بدلتی لائنیں چرچرانے لگیں اور پھر ایک دھچکے کے ساتھ گاڑی رک گئی۔ سٹیشن پر خوب گہما گہمی تھی۔ قلی لوگوں کے بولڈال۔ اٹیچی اور بکس اٹھائے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ گاڑی میں سوار ہونے والے خاصا رش کر رہے تھے۔ اترنے والی سواریاں بھی دروازوں کی طرف اُمڈ رہی تھیں۔

تھرڈ کلاس کے ڈبے میں توقیر درمیان والی سیٹوں پر سے اُٹھا اور نیچے اترنے کے لیے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ لیکن، دروازہ بند تھا اور سامنے گیلری میں لوگوں نے سامان کے ڈھیر لگا رکھے تھے۔ دروازہ کھلنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ دروازے کے سامنے سامان کے ڈمپ پر چند بے فکرے اور لاابالی سے

جوان بیٹھے چرس بھرے سگرٹوں کے کش لگا کر بدبودار دھوئیں سے ڈ

کی فضا کو مکدر بنا رہے تھے۔ باہر چڑھنے والی سواریاں دروازہ پیٹ رہی تھیں لیکن

ان جوانوں پر کچھ اثر نہ تھا۔ اور یوں بے فکری سے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ گویا

کے ڈبے میں ہیں۔ باپ کی جاگیر میں بیٹھے ہوں۔

شاید ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ ٹرین میں جتنا حق ان کا ہے اتنا ہی د

لوگوں کا ہے۔ کاش معاشرے کے ایسے کارکن سمجھ جائیں کہ اتحاد باہمی محبت اور خ

خلق سے جو جوہر پیدا ہوتے ہیں وہ قوم کے نظم وضبط اور ترقی میں سنگ میل کی حیثیت

رکھتے ہیں۔ پر کون سمجھائے ایسے لوگوں کو کہ ان کی یہ حرکت دوسروں کے لیے کس ق

تکلیف کا باعث ہے۔

باہر کبھی کوئی جوان جذباتی پن میں دھمکی آمیز لہجہ کے ساتھ دروازہ کھولنے کو ک

لیکن بے سود۔

کبھی کوئی بوڑھا منت سماجت کرتا لیکن نتیجہ وہ ہی ڈھاک کے دریاٹ۔

کبھی کوئی بھولی بھالی دیہاتی عورت آنکھوں میں ایک فریاد لیے بند درواز

کے شیشوں میں سے جھانکتی۔ لیکن ان جوانوں کی بے شرمی اپنی جگہ اٹل تھی اور س

باری باری گالیاں دیتے ہوئے دوسرے ڈبوں کی طرف چلے جاتے۔

توقیر دروازے کی یہ حالت دیکھ کر کھڑکی میں سے پلیٹ فارم پر کودا اور تھوڑا

آگے بڑھ کر انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے کی کھڑکی میں سے اندر جھانکا سامنے منزہ

تھی۔ خوب گوری چٹی اور تیکھے نقوش کی خوبصورت، معصوم اور بھولی بھالی سے ا

بھی۔ اس کے پاس ہی اس کی ماں سیٹ پر لیٹی تھی۔ توقیر نے بڑے پیار سے منزہ کو
پکارا۔

"زی!"

توقیر کو دیکھتے ہی منزہ اٹھی اور کھڑکی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"آپ اتنے رش میں کیوں اترے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں خالہ کیسی ہیں ——؟"

"سو گئی ہیں ——"

"شکر ہے ——"

"تمہیں کوئی چیز چاہیئے ——؟"

"نہیں ——"

"پانی ہے صراحی میں ——"

"ابھی تو بھری ہوئی ہے۔"

"اچھا ٹھہرو میں تمہیں کوئی فروٹ لا دیتا ہوں۔"

نہیں بھائی جان! کوئی ضرورت نہیں۔ اب اگلے اسٹیشن پر تو ہم نے اتر ہی
جانا ہے۔ ابھی تو ساٹھ میل کا سفر ہے۔ یوں بیٹھے تو بور ہو جاؤ گی۔

فروٹ کا کیبن کافی پیچھے تھا۔ توقیر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اس طرف بڑھا کیبن پر
خوب رش تھا جس کے باعث اسے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ فروٹ لے کر جب وہ
واپس لوٹا تو گاڑی آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے بھاگا۔ منزہ کھڑکی

میں سے زور زور سے چلا رہی تھی ۔

"ادھر ہی کسی ڈبے میں بیٹھ جائیے بھائی جان !"

توقیر نے اپنے ڈبے میں سوار ہونا چاہا۔ لیکن دروازہ تو اندر سے بند تھا اور چلتی ٹرین پر کھڑکی میں سے سوار ہونا ممکن نہ تھا۔ منزہ اسے کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ بمشکل تمام وہ ایک ڈبے کو پکڑ سکا اور فورڈ بورڈ پر کھڑے ہو کر اس نے بند دروازے کا ہنڈل گھما کر پیچھے دھکا دیا تو دروازہ کھل گیا۔

پہلی ہی نگاہ میں اس نے اندر داخل ہو کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کوئی فسٹ کلاس کا دو سیٹوں والا ڈبہ تھا۔ ایک کونے میں کسی کا اٹیچی پڑا تھا۔ سیٹ پر بڑی خوبصورتی سے چنا ہوا ایک دھانی دوپٹہ اور چند رسالے بکھرے پڑے تھے۔ توقیر کچھ الجھ گیا پتہ نہیں کیوں۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جھجکتے ہوئے سیٹ پر بیٹھ گیا اور رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگا۔ کوئی دس منٹ گذرنے تھے کہ سامنے غسل خانے کا دروازہ کھلا اور ...

اور

بے حد خوبصورت پرنٹ کی قمیص اور اسی سے میچ کرتے ہوئے رنگ کی شلوار میں ایک حسین ترین اور نوخیز لڑکی باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر جاذبیت اور نسوانی حسن طوفانی تھا۔

تنگ لباس میں پھنسا پھنسا سا رس کا گورا اور گداز جسم

سفید پنڈلی میں کچھ ڈھکے اور کچھ ننگے سفید بھیگے سے پاؤں

نگاہوں سے گرتی ہوئی برق۔

دھلا دھلا سا خوش رنگ و خوش کن چہرہ

کولہوں تک بکھرے ہوئے بال

اخا

قیامت تھی قیامت

وہ ——— اسے دیکھ کر گھبرا سا گیا۔ رسالہ اس نے پھر سیٹ پر رکھ دیا۔ لڑکی شاید غسل کر کے نکلی تھی اس لیے ہاتھ میں پکڑا ہوا معمولی سا میلا لباس وہ غصے میں ایک طرف پھینکتی ہوئی جیسے برس ہی تو پڑی۔

"کون ہو تم ؟"

"توقیر بدحواس ہو گیا۔"

"جی —— جی —— میں ——— دراصل چلتی ٹرین میں سوار ہوا۔ اس لیے غلط ڈبے میں آگیا۔"

"وہ اور قہر آلود ہو گئی۔"

شرم نہیں آتی زنانہ ڈبے میں سوار ہوتے۔

توقیر نے ذرا ہمت سے کام لیا۔

"کہہ جو دیا یہ ایک مجبوری تھی۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ ابھی نیچے اترو" اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

توقیر نے سنجیدگی سے کہا۔

"جان بوجھ کر کون موت سے بغلگیر ہوتا ہے۔"

"وہ اور بپھر گئی۔"

"تو تم اراداً تا دھرنا مار کر آ بیٹھے ہو۔"

"جیسے سمجھ لیں۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا۔"

"لوفر ——"

"بدمعاش"

"غنڈہ"

"آوارہ"

"ذلیل"

"میں تمہیں پولیس کے حوالے کروں گی۔"

توقیر نے پھر بڑی متانت سے جواب دیا۔

"آپ جیسی پڑھی لکھی لڑکی کو ایسے گندے الفاظ کی یہ گردان زیب نہیں"

"عورتیں بھی تو اکثر مردوں کے ڈبوں میں سفر کرتی ہیں۔ کیا مرد بھی ان کے ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔"

پاؤں پٹختی ہوئی وہ پھر غسل خانے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد بال در کر کے باہر نکلی اور غصے میں اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"تمہارے پاس ٹکٹ کون سی کلاس کا ہے۔"

توقیر نے بے ساختہ کہا۔

"تھرڈ کلاس"

وہ اور طیش میں آ گئی۔

"شرم نہیں آتی کیا۔ فسٹ کلاس کی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے۔"

توقیر کچھ غمگین اور اداس ہو گیا خجالت اور خاموشی سے اُٹھ کر دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ لڑکی نشست پر بیٹھ گئی اور رسالہ اٹھا کر پڑھنے لگی۔

توقیر دروازے کے پاس کھڑا رہا۔

وہ بیٹھی پڑھتی رہی۔

ٹرین چلتی رہی۔ فاصلے اس سے گلے ملتے رہے۔

غبار اڑتا رہا۔ سفید سفید دور دور تک پھیلا ہوا۔

غبار

جو منزل کی طرف جاتے راستوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

ہلکا سا ایک دھچکا لگا اور گاڑی رُک گئی۔ توقیر نیچے اترنے لگا۔ لڑکی سیٹ بر پڑے اس کے فروٹ کے لفافے کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت اور بیزاری کی ن جلی آواز میں بولی۔

"اپنا فروٹ لیتے جاؤ۔"

توقیر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"رکھ لو۔ گالیوں کی گردان گاتے گاتے تمہارا گلہ خشک ہو گیا ہوگا۔"

"اجڈ" غصے میں اس نے پہلو بدلا۔

"شکریہ"

"بیہودہ"

"نوازش۔"

پلیٹ فارم پر اتر کر توقیر چند ہی قدم آگے بڑھا ہو گا کہ سامنے سے آتا ہو
اس سے آ کر گلے مل گیا۔

"کہاں سے آرہے ہو؟ ——"

"روپ پور سے اپنی خالہ کو لے کر آرہا ہوں۔"

"کب گئے وہاں؟"

"کل گیا آج لوٹ رہا ہوں۔"

"تم کہاں سے آئے ہو۔"

"چھوٹی بہن کچھ دنوں کے لیے مری گئی ہوئی تھی۔ اسے ساتھ لے کر"

"کامران بھائی کیسے ہیں۔"

"خوش ہیں۔ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں"

"کسی دن جاؤں گا۔ ان سے ملنے"

"وہ خود تمہیں چائے پر بلانے والے ہیں۔ لیکن ان سے قبل میں پہلے
چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"یہ کہ پرسوں سہ پہر کو میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

"کیوں؟ ——"

"ہلکی سی چائے پارٹی دے رہا ہوں۔ اور بہت سے لوگ بھی ہوں گے۔"

"فضول اخراجات ہیں یہ ——"

"فضول نہیں بھائی۔ دوستوں کو مل بیٹھنے کا ذریعہ ہو گا۔"

"جو بھی ہو۔ پرسوں میں لینے آؤں گا۔ جانا نہیں کہیں۔"

اتنے میں فسٹ کلاس کے ڈبے سے وہی لڑکی اتری۔ قیصر اسے دیکھتے ہی
بولا۔ یہ میری چھوٹی بہن برجیس ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔ پرسوں ملیں گے۔ وہ
آگے بڑھ گیا۔ برجیس سے جا کر قیصر نے اس کا اٹیچی لیا تو وہ نیچی سی آواز میں بولی

"کون تھا یہ بھائی جان!"

"میرا دوست ہے اچھا لڑکا ہے۔"

برجیس کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیا سوچ کے خاموش ہو رہی۔
توقیر تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ زنانہ انٹر کلاس میں جب وہ داخل ہوا تو منزہ
اسے دیکھتے ہی فکر گیر نگاہوں سے بولی۔

"اللہ۔ بھائی جان آپ نے تو جان ہی نکال دی تھی۔ رش اگر اس قدر تھا
تو آپ گاڑی سے اترے ہی کیوں تھے۔ خدا نہ کرے اگر آپ گاڑی سے رہ
جاتے پھر؟ ——"

توقیر مسکرا دیا۔

"دوسری گاڑی سے آجاتا۔"

"بہت کٹھور ہیں آپ۔ ہم جاکر خالہ جان سے کیا کہتے ؟"

"اچھا چھوڑو۔ گھر جاکر باتیں ہوں گی میں قلی بلاتا ہوں۔"

دروازے کے پاس کھڑے ہوکر اس نے آواز دی۔

"قلی! ارے قلی ——"

دو قلی بھاگتے ہوئے آئے۔

"سامان ہے بابو جی۔"

"ہاں ہاں —— آؤ"

توقیر نے منزہ کی طرف دیکھ کے کہا۔

"نزی! ان سے سامان اترواؤ۔ اپنی چیزیں دیکھ لینا۔"

منزہ سامان اتروانے لگی۔

اب کے ممتاز بھی بولی۔

"تم نے یہ کیا کیا بیٹا! چلتی ٹرین میں بیٹھے۔ میں تو اس سارے وقت کلپتی ہی رہی۔"

"بس غلطی ہوگی تھی خالہ جان!" سہارا دے کر اس نے ممتاز کو اٹھ گاڑی سے باہر لایا۔ قلیوں کے ساتھ تینوں سٹیشن سے باہر آئے اور ٹیک کو یہ تار کول کی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

کئی دنوں سے وہ ایک تصویر مکمل کرنے کی کوشش میں تھا۔ لگاتار کئی رنگ اس میں بھر رہا تھا۔ کبھی پس منظر درست ہوتا کبھی پیش منظر سنورتا۔ کوئی کلر شوخ کرتا اور کوئی مدہم یوں لگاتار محنت سے اِس روز تصویر مکمل ہوئی۔ ایک لمبا سانس سکون اور اطمینان کا لیا اور ہاتھ میں پکڑا ہوا برش رکھ دیا۔ کچھ سوچ کر اُٹھا اور ذرا پیچھے ہے تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔

پس منظر میں دور بہت دور سورج ندی میں ڈوب رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈ لو جھومتا ہوا اور ساتھ ہی شفق کے رنگ میں ڈوبی ہوئی فضاؤں میں ایک خوبصورت پپیہا چونچ کھولے پرواز کرتا جا رہا تھا۔ پیش منظر میں ایک پنگھٹ تھا اور ایک خوبصورت ہقانی لڑکی پانی بھر کے خزاں رسیدہ لمبے لمبے درختوں میں سے ہوتی ہوئی پگڈنڈی

پروا پس لوٹ رہی تھی۔ اس کے ماتھے سے گھونگٹ ایک طرف سرک گیا تھا او
کا شفاف پانی چھلک رہا تھا۔ دونوں سینوں کے بائیں طرف ایک بوسیدہ سا مَ
تھا جس کے دور کش میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔

وہ مسکرا دیا۔

اس مسافر کی طرح جو انتھک محنت سے منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہ
اس کے خیالات کا ہجوم بکھر گیا۔ منزہ اور شہناز اس کے کمرے میں دا

" بھائی جان ! کیا ہر وقت اپنے کمرے میں ہی گھسے رہتے ہیں۔ کبھی باہ
ہوا بھی لیا کریں" منزہ نے محبت بھری ڈانٹ سے کہا لیکن جونہی اس
دیکھی، چونک دی۔

" اللہ ! بھائی جان ! کس قدر بہترین تصویر بنائی ہے۔ میں تو سوچ بھ
نہیں کہ ہمارے بھیا اس قدر بڑے آرٹسٹ ہیں۔"

توقیر مسکرا دیا۔

" جھوٹ۔"

" نہیں بھیا ! "

" رسمی تعریف۔"

" ہرگز نہیں۔"

" شکریہ —— "

توقیر اپنی بہن شہناز کی طرف دیکھ کے بولا۔

" شہناز ! امی کہاں ہیں "

" ٹیوشن پڑھانے گئی۔"

" ابھی تک نہیں آئیں۔"

" نہیں۔"

" پہلے پہر کتنے بجے آتی ہیں ٹیوشن پڑھا کر۔"

" میں تو اس وقت کالج ہوتی ہوں بھائی جان۔ ویسے میرا خیال ہے پہلی ٹیوشن گیارہ بجے ختم کرتی ہیں اور دوسری ایک بجے سے پانچ بجے تک پڑھاتی ہیں —— "

منزہ نے دکھ سے کہا۔

" وحید بھائی وکیل ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے خالہ جان دو دو ٹیوشن پڑھانے کی محنت کیوں کرتی ہیں۔"

توقیر نے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

" شی ! ہماری بھابی بہت گرم مزاج ہیں ہم دونوں بہن بھائی کی فیس کے علاوہ کچھ نہیں دیتیں۔ نہ جیب خرچ۔ نہ کپڑے نہ کتابیں یہ سارا خرچ امی جان پر ہے اور میری ان تصویروں پر" منزہ اداس ہو گئی۔

" بہت بُری بات ہے۔"

شہناز بھی افسردہ ہو گئی۔

" کن باتوں میں پڑ گئے بھائی جان۔ ڈریس بدلیے اور چلیں۔"

" کہاں ؟ "

"ممتاز خالہ کو دیکھنے ذرا ہسپتال جانا ہے۔"

"کون کون جا رہا ہے؟"

منزہ نے جواب دیا۔

"میں، شہناز، آپ کی بھابی محترمہ کے بھائی زاہد اور آپ"

"آپ لوگ ہو آئیں میں اس وقت نہ جا سکوں گا۔ میں ایک جگہ جاتے ہوں۔ وہ مجھے لیتے آتے ہی ہوں گے۔ ویسے میں کالج سے لوٹتے ہوئے کو دیکھ کے آیا ہوں۔"

اتنے میں باہر کار کا ہارن سنائی دیا۔ توقیر چونک گیا۔

"لو وہ آگئے۔" وہ تیزی سے باہر آیا۔ قیصر اپنی کار لیے کھڑا تھا۔ توقیر ہی بولا۔

"بھئی تم تو ابھی تک تیار ہی دکھائی نہیں دیتے؟"

توقیر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آؤ اندر آ کر بیٹھو۔ میں جلدی جلدی کپڑے بدل لیتا ہوں۔"

"نہیں میں یہیں کھڑا ہوں۔ تم جلدی آؤ۔"

"یہ کیا تک ہوئی؟"

"سب وقت ضائع کرنے کی باتیں ہیں توقیر جلدی جاؤ اور جلدی آؤ"

توقیر اندر چلا گیا۔ اور جلدی ہی واپس آگیا۔

توقیر کو لے کر قیصر اپنی محل نما کوٹھی میں داخل ہوا۔ صحن عبور کر کے جب

میں تھوڑا سا آگے گئے تو کھانا پکانے کے کمرے کے سامنے سے گذرتے ہوئے وہ رک گیا اور حیرت و استعجاب سے اندر دیکھنے لگا کمرے میں اس کی ماں ساجدہ بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی اس کے ہاتھ راکھ سے اٹے ہوئے تھے۔ توقیر نے دکھ سے پکارا۔

"ماں!"

ساجدہ دروازے کے پاس آگئی اور تعجب آمیز لہجہ میں اٹک کر بولی۔

"توقیر! تم یہاں ——"

توقیر کے چہرے پر غم اور بے رونقی کی لکیریں پھیل گئی۔

"ماں! تم نے مجھے کہا تھا میں ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ میں امید بھی نہیں کر سکتا تھا کہ تم کسی کے ہاں ملازمہ کا کام کرو گی۔ بہت بُرا کیا تم نے ماں۔"

ساجدہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بس بے بسی سے بیٹے کو دیکھتی رہ گئی۔

قیصر نے ایک قریبی ستون کا سہارا لے کر دکھ سے گردن جھکا لی۔

اتنے میں ایک طرف سے برجیس آتی دکھائی دی۔ وہ دونوں ماں بیٹے کو باتیں کرتے دیکھ چکی تھی۔ ساجدہ اس کی جھلک دیکھتے ہی چپ ہو رہی۔ برجیس تیز تیز قدموں سے ادھر آتی۔ توقیر کو دیکھتے ہی اس کے تیوروں پر جل پڑ گئے۔ ذرا ڈانٹ کے انداز میں اس نے ساجدہ سے پوچھا۔

"تم اسے کیسے جانتی ہو بڑی بی!" اس نے توقیر کی طرف اشارہ کیا۔

ساجدہ جلدی ہی سنبھل گئی۔

میں اس سے پہلے نکل روڈ پر ایک جاگیردار کے ہاں ملازم تھی یہ ان کے لڑکے

ہیں۔ بیٹے کو سوسائٹی میں گرنے سے بچانے کی خاطر ساجدہ نے جھوٹ بولا۔

توقیر نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں احتجاج کیا لیکن ساجدہ نے اس کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ قیصر اس کا ہاتھ پکڑ کر جب ڈرائنگ روم کی طرف لے گیا تو برجیس پھر ساجدہ کو مخاطب کرتی ہوئی بولی۔

امیر گھرانوں کے لڑکے اکثر آوارہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کو منہ نہیں لگانا چاہ کیونکہ ان کی پرورش مغربی ماحول میں ہوتی ہے۔ غریب گھرانوں کے لڑکے مغ سے دور مشرقی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ ان کے گھروں کا ماحول بھی ساز گا ہے۔ لہٰذا وہ کتنے بھی شریر کیوں نہ ہوں۔ ان میں شرم و حیا کی بوباس ضرور ہوتی ہے۔

ساجدہ نے نیچی آواز میں کہا۔

"یہ لڑکا اچھا ہے بیٹی!"

"ظاہراً ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ مگر باطن ان سب لوگوں کا سیاہ ہ

ساجدہ چپ ہو رہی۔

کریمن بوا کدھر گئی۔ برجیس نے دوسری خادمہ کو پوچھا۔

ڈائننگ روم میں چائے کے برتن لگا رہی ہے ——"

اسے کہنا میری چائے میرے کمرے میں پہنچا دے۔

"تم وہاں نہیں جاؤ گی بیٹی؟ ——"

"نہیں بڑی بی! وہاں امیر مرد جو بیٹھے ہیں۔ بس بھائی تو وہاں ہیں

میں؟ تو میری دادی مشرقی تھی، میری ماں مشرقی تھی اور میں بھی مشرقی ہوں اور تم جانتی ہو، ایک مشرقی لڑکی ایسے ماحول میں کیونکر بیٹھے گی؟"

ساجدہ ہلکے سے مسکرا دی۔

"بڑے خیالات ہیں تمہارے۔ جیتی رہو!"

برجیس اپنے کمرے میں چلی گئی ساجدہ پھر مردہ سی پھر اپنے دھندے لگ گئی۔

توقیر کو لے کر قیصر ڈرائینگ روم میں آیا اور دائیں اور بائیں کچھ مرد اور عورتیں ملے جلے بیٹھے تھے۔ سامنے صوفہ پر کامران تھا اس کے دائیں بائیں اس کی چچازاد بہن فرخندہ اور چچازاد بھائی انیس بیٹھے تھے۔ قیصر نے اس خیال سے کہ مبادا برجیس سُن رہی ہو۔ ساجدہ کے کہے ہوئے الفاظ کے بموجب سب سے توقیر کا غلط تعارف ہی کرایا

کامران نے کچھ کہنا چاہا مگر قیصر نے آنکھ کے اشارہ سے اسے چپ کرا دیا۔ توقیر بجھا بجھا سا قیصر کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گیا۔ کامران اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس بیٹھتا ہوا دھیرے سے پوچھنے لگا۔

"خیریت تو ہے بجھے سے کیوں ہو؟"

توقیر نے زبردستی ہونٹوں پر بشاشت کے آثار پیدا کر لیے۔

"کہاں بجھا ہوں، ابھی تو جل ہی رہا ہوں۔"

قیصر کی آواز نے سب کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔

فرخندہ! وہ تمہاری سہیلی اور کلاس فیلو نہیں کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا۔

فرخندہ نے گلے میں ہار کی طرح لٹکتا ہوا اپنا مہین بسنتی دوپٹہ گلے ہی میں درست

کرتے ہوئے کہا۔

"کنول ؟"

"ہاں ہاں وہی"

"میں اور بھائی جان اس کے ہاں اسے لینے گئے تھے۔ نہیں آئی وہ"

"مشرقی ہے کیا ؟"

"ہاں بالکل خالص گھی کی طرح ——"

"تو مغرب زدہ لڑکیاں کیا ڈالڈا یا تلو ہوتی ہیں۔" قیصر نے شوخی سے کہا۔

فرخندہ جز بز سی ہوگئی۔

دوسری طرف کنول کا نام سُن کر توقیر کے کان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ کم
استعجاب اور فکریہ انداز میں کبھی قیصر اور کبھی فرخندہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ا
نگاہیں بار بار کچھ ایسے انداز سے جھپکتی جیسے کہہ رہی ہوں، تم کنول کو کیسے جانتے
اس کے دل اور ذہن میں اٹھنے والے خیالات بھی کچھ ایسے ہی سوالات کی
دھار رہے تھے۔

گھر کی دوسری ملازمہ ڈرائینگ روم کے سامنے برآمدے میں سے گزری
نے اسے پکارا۔

"کریمن بوا!"

ملازمہ دروازے کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"جی ——"

"سامان لگ گیا کیا ؟"

"جی ہاں ——"

قیصر کھڑا ہوگیا۔

"چلیئے چلیں ——"

سب اُٹھ کر کھانے کے کمرہ کی طرف چل دیئے۔

لمبی سی میز پر سفید چادر کے اوپر اَن گنت پلیٹیں ترتیب سے لگی تھیں۔
جن میں طرح طرح کی چیزیں سفید جالی سے ڈھکی تھیں۔ کپڑا ہٹایا گیا تو پلیٹیں
چمک اٹھیں۔

روسٹ کی ہوئی مرغیاں
فرائینگ فش
چکن سینڈوچ
پیٹیز
کیک
اور بہت کچھ

سب کے منہ چلنے لگے

فرخندہ نے چند ثانیئے تک اِدھر اُدھر دیکھا پھر کسی قدر سوالیہ انداز میں قیصر
سے پوچھا۔

"برجیس کہاں ہے ؟"

قیصر نے ہنس کے کہا۔

" وہ بھی خالص مشرقی ہے۔ مردوں کے فنکشن میں نہیں آتی۔"

فرخندہ نے طنز سے کہا۔

" عجیب لڑکیاں ہیں۔ پڑھ لکھ کے بھی قدامت پسند ہی رہتی ہیں۔ آج ملا
کرتی ہوئی اس سے بات۔"

دو چار مختلف چیزیں اس نے جلدی جلدی حلق سے نیچے اتاریں اور پھر چپکے
سے باہر نکل کر سیدھی برجیس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اندر بیٹھی چائے پی
چکی تھی اور خالی پیالی اس کے سامنے میز پر رکھی تھی۔ فرخندہ جھٹ کرسی کھینچ کر
اس کے سامنے ہو بیٹھی۔

" محترمی گرامی قدر تم کیوں پارٹی میں نہیں گئی ہو؟"

برجیس نے شائستگی اور سنجیدگی سے کہا۔

" ضروری تھا کیا؟ بھائی جان تو وہاں ہیں۔ ویسے بھی مردوں کے فنکشن میں
مرد ہی اچھے لگتے ہیں۔" پڑھ لکھ کے بھی دقیانوسی بنی رہی تم۔ کیا فائدہ تمہارے
ایم بی بی ایس کرنے کا۔ پڑھائی کے دوران بھی تو تمہیں مردوں کا سامنا کرنا پڑتا
ہے۔" اب کیوں کترانے لگی ہو۔ ان جیسے ہی مرد یہ بھی ہیں۔ فرخندہ نے ذرا چبا
کے انداز میں کہا۔

برجیس پھر پہلے انداز میں کہنے لگی۔

کالج والے مردوں اور ان مردوں میں بہت فرق ہے۔ ایک تو وہاں مجبو

تھی ہمیں پڑھنا جو تھا۔ دوسرے ہم ان کے کسی تاریک پہلو سے واقف نہ تھے۔ ہو
سکتا ہے بُرے ہی ہوں۔ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن پارٹی
والے مردوں اور عورتوں کے متعلق میں بہت کچھ اچھی طرح جانتی ہوں۔"

" کیا جانتی ہو تم؟"

سب نائٹ کلب کے ممبر ہیں۔ اکثر مردوں اور عورتوں کے تعلقات شادی
جیسے ہیں۔ تعلقات تو خیر اپنا اپنا انفرادی رویہ ہے رہی نائٹ کلب کی ممبر شپ۔
تو نائٹ کلب جانا کوئی گناہ نہیں مجھے دیکھو میں بھی نائٹ کلب کی ممبر ہوں روزانہ
وہاں جاتی ہوں۔ لیکن میرے تو کسی کے ساتھ تعلقات نہیں۔

ابھی نہیں ہیں تو کسی دن ہو ہی جائیں گے۔ نائٹ کلب جانا ثواب جو سمجھتی
ہو تو اس کے ماحول کے مطابق ڈھلنا ہی پڑے گا۔ اور وہاں جانے کا نقصان بھی
اٹھانا ہوگا۔

" کیا نقصان ہے وہاں جانے کا؟ ————"

" تم ذرا کوئی فائدہ تو بتاؤ پہلے ————"

" فائدہ۔"

" ہاں۔"

" میں تو اپنی کہتی ہوں۔ دن بھر کی کوفت کے بعد جب کلب کے ماحول میں
اپنے کسی ساتھی کے ساتھ کوئک سٹیپ بار نبھانا چاہتی ہوں تو سارے دکھ درد
مٹ جاتے اور ایک انوکھا سا سکون محسوس کرتی ہوں۔"

برجیس نے استعجاب سے پوچھا۔

" تو تم کوئک سٹیپ اور رمبا بھی ناچتی ہو ؟"

فرخندہ نے برجستہ کہا۔

" ہاں تو۔"

" بہت اچھا کرتی ہو۔ بس تم گئیں ہمارے کام سے۔"

" پھر وہی دقیانوسی باتیں۔ تم تو آنکھیں بند کر کے کسی سے شادی کر لو اور
شوہر پرست کی سی زندگی بسر کرو۔"

" اس سے بڑھ کر عورتوں کو اور کیا چاہیئے۔"

" تو پھر کر لو نا شادی۔"

" کر لوں گی۔"

" کب ؟——"

" بہت جلد——"

لڑکا پسند کیا کوئی ؟

یہ تو بھائی جان کا کام ہے۔ ویسے میں نے انہیں اپنی پسند سے آگاہ کر

کیا ؟

یہی کہ لڑکا پڑھا ہو۔ بیشک غریب ہو پرواہ نہیں شکل و شمائل اور سیر
کردار کا اچھا ہو۔ خوش مزاج ہو سڑیل نہ ہو۔

بس ؟

اور دبی دبی زبان میں لڑکے کی طرف اشارہ بھی کر دیا ہے۔

کون ہے کیا نام ہے اس کا میں بھی تو جانوں

اور سمجھی یہ جو پارٹی میں آیا ہوا ہے۔ اچھا جوڑا رہے گا۔ لڑکا خوب صورت ہے۔
عمر میں تم سے دو تین برس چھوٹا ہی ہوگا۔ پرسنیلٹی بھی اچھی ہے اور

برجیس نے اس کی بات کاٹ دی۔

پاگل ہو تم یہ نہیں جانتی۔ یہ تو کسی بہت بڑے جاگیردار کا لڑکا ہے۔ ویسے بھی
کچھ مغرور ہے اور محنتی ہونے میں حدِ اعتدال سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ مجھے تو یہ ایک
آنکھ نہیں بھاتا۔ پتہ نہیں بھائی جان کیوں پکڑ لاتے ہیں۔ ایسوں کو میرے بس
میں ہو تو کان سے پکڑ کر کھڑے کھڑے نکال دوں۔

تو پھر کون ہے ؟

" وہ اور توقیر ہے ؟——"

" کیا کرتا ہے۔"

" بی اے میں پڑھتا ہے اور مصور بھی ہے——"

" تم نے دیکھا ہے ؟——"

" نہیں بھائی جان کا دوست ہے۔"

" کیا کہتے ہیں خوب صورت اور اچھا ہے۔"

" ہاں بہت تعریف کرتے ہیں۔"

" تم نے دیکھ لیا ہوتا۔"

بھائی جان کہہ تو رہے تھے ۔ آج چائے پہ لانے کے لیے لیکن یہ تو کہ

توقیر کو ہی پکڑ لائے ۔ ہو سکتا ہے وہ نہ ملا ہو ۔

" کہیں اسی سے تو نہیں بیاہا جا رہا تمہیں ۔"

" نہیں نہیں اسے تو میں کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی ۔ اس کا تو گل

گھونٹ دوں گی ۔"

" تو پھر اس توقیر کو تم کیسے جاننے لگی ہو ؟"

" ان تصویروں کی طرف دیکھو ۔ برجیس نے کمرے کی دیواروں پر لٹکتی ہوئی

فریموں والی تصویروں کی طرف اشارہ کیا ۔"

" اس کی تصویریں ہیں یہ ؟"

" ہاں ! سب اس کی ہیں ۔ جو بھی اس کی تصویر بازار میں آتی ہے میں

" ایسے ہی لڑکے سے شادی کرنا تھی تو ایم بی بی ایس کرنے کا کیا فائد

ہر چیز میں فائدہ ہی نہیں ڈھونڈا جاتا ۔ میں نے نوکری تو کرنا نہیں

کے اللہ تعالیٰ نے بے فکر ہی رکھا ہے ابا جان اس قدر جائیداد چھوڑ گئے

پشتیں بیٹھ کر کھاتی رہیں تو ختم نہ ہو ۔ میں تو بس محلے میں کوئی عورت بیمار ہو ج

اس کا مفت علاج کر دیتی ہوں ۔ شہر کے کسی دوسرے محلے سے بھی اگر کوئی

تو چلی جاتی ہوں اور دوائیوں تک کے پیسے نہیں لیتی اور اپنے اسی کام پر مط

" عجیب خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ لڑکی ہو ۔"

" کیا خامی ہے مجھ میں ۔"

" مشرقی ہو ۔"

" یہ کوئی خامی نہیں مجھے اپنے مشرقی ہونے پر فخر ہے ۔"

" خوبی یہ ہے کہ درد مند دل رکھتی ہو ۔"

" اس کے لیے شکریہ "

کریمن بوا اندر آئی

" بی بی جی ——" فرخندہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا ۔

" کیا ہے ۔" فرخندہ نے پوچھا ۔

" آپ کے بھائی باہر آپ کو بلا رہے ہیں ۔"

فرخندہ کھڑی ہو گئی ۔

" اچھا مس مشرقی پھر ملیں گے ——"

" کوٹھی کے باہر انیس کار کے پاس اس کا انتظار کر رہا تھا ۔ برجیس کے پاس

سے اُٹھ کر وہ باہر آئی اور تیزی سے دالان عبور کرنے لگی ۔

"بس میں کالج چھوڑ دوں گا۔"

"نہیں پڑھوں گا۔"

"میں کہیں سروس کروں گا۔ ——"

"جس جوان بیٹے کی ماں کسی کے ہاں ملازمہ کا کام کرتی پھرے

کی زندگی اور پڑھائی پر۔ توقیر نے کس قدر خفگی سے کہا۔

سامنے بیٹھی ہوئی ساجدہ نے پیار سے کہا۔

"مجبور تھی بیٹا! ایسا نہ کرتی تو کیا کیا کرتی؟"

"آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ ——"

"کیا کرتے تم؟ ——"

میں پڑھائی چھوڑ کر کوئی کام تو کرتا۔

بس باتیں نہ بناؤ۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ ماں باپ تو اولاد کی تعلیم کے
لیے اس سے بھی زیادہ کر گزرتے ہیں۔

پر آپ کو کیا پڑی اس قدر تکلیف اٹھانے کی۔ وحید بھائی کس لیے ہیں آخر
را شہناز اور آپ کا اس پر کوئی حق تو ہے۔ بھائی ہے کوئی میں اس کا ملازم تو نہیں
دں۔ مجھے امید نہ تھی۔ بھائی جان شادی کے بعد اس طرح بدل جائیں گے۔

ان کی کیا بات کرتے ہو بیٹا! ان دونوں میاں بیوی نے تو کبھی جھوٹے منہ بھی کسی
ر کے لیے نہیں پوچھا اور میرے اپنے پاس کافی چڑیا بھی نہ تھی جو میں تم دونوں بہن
ائی کا خرچ برداشت کر سکتی۔

توقیر نے جذباتی پن سے کہا۔

تم فکر نہ کرو ماں! میں آج بھائی جان سے بات کروں گا۔

کوئی ضرورت نہیں بات کرنے کی۔

تو پھر ٹھیک ہے نہ آپ کہیں کام کریں گی نہ میں پڑھوں گا۔ میں سروس کرتا
ہیں۔

الٹی باتیں نہ کیا کرو بیٹا! داخلہ تمہارا تو چلا ہی گیا ہے۔ امتحان میں صرف ایک
ہی تو رہ گیا ہے۔ محنت سے پڑھو اس کے بعد جو جی میں آئے کرتے رہنا میں
یں کروں گی۔

توقیر نے کہنا چاہا، لیکن ساجدہ نے اسے موقع ہی نہ دیا۔

"بس اس موضوع پر بات چیت ختم۔ یہ بتاؤ ممتاز کے پاس ہسپتال گئے؟"

"گیا تو تھا۔ وہیں سے آ رہا ہوں ابھی۔ منزہ اور شہناز بھی میرے ساتھ گئی تھیں۔ ان کی حالت تو پہلے سے بھی خراب ہے ——"

"خدا اپنا رحم کرے۔ میں بھی جاتی تو سہی لیکن میری طبیعت کچھ بھاری سی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے بخار ہو گیا ہو۔ جسم ٹوٹ رہا ہے۔"

"شہناز سے کہہ کے اسپرو لے لیں اور بستر میں آرام کریں۔ تکان سے یہ حرارت ہو گئی ہوگی ——"

اتنے میں منزہ کمرے میں داخل ہوئی۔

توقیر اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوا بڑے پیار سے بولا۔

"آؤ زی! بیٹھو ——"

"آپ بیٹھیں بھائی جان! وہ اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

"تم بیٹھو مجھے ذرا ایک کام سے باہر جانا ہے۔"

منزہ بیٹھ گئی تو توقیر اپنے کمرے میں آیا۔ اسی دن مکمل کی ہوئی تصویر اُٹھا بازار کی طرف نکل گیا۔

لارنس روڈ کے چوک پر سے گزرتے ہوئے وہ رُک گیا سامنے ایک کنول کھڑی تھی۔ سفید دوپٹے کے نیچے اور اس پہننے میں بے حد خوبصورت دے رہی تھی اس کا دھیان دوسری طرف تھا۔ توقیر نے اس سے قریب ہلکے سے پکارا۔

"کنول!"

اس نے فوراً پیچھے دیکھا۔

"آپ!" اس کی آواز میں سوالیہ پن تھا۔

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟ ——"

"کالج سے نکلی ہوں۔ گھر جانے کے لیے بس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"آؤ چلیں ——"

وہ کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ ہو لی۔

چوک کے دائیں طرف کچھ ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ توقیر نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔

"ریلوے کالونی کی طرف چلو گے بھئی؟"

"ضرور چلوں گا صاحب۔ آئیے بیٹھئے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے دروازہ کھول دیا۔

دونوں جب اندر بیٹھنے لگے۔ پیچھے سے کسی نے بے تکلفانہ پکارا۔ آواز کسی مرد کی تھی۔

"کنول! ——"

دونوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ پکارنے والا انیس تھا۔ وہ اپنی کار سے سر باہر نکالے ہوا تھا اور پچھلی سیٹ پر فرخندہ بیٹھی ہوئی تھی۔

انیس نے پھر کہا۔

"آؤ کنول بیٹھو۔ جاتی دفعہ تمہیں ڈراپ کرتے جائیں گے۔"

شکریہ انیس بھائی۔ اب تو ہم نے ٹیکسی کرلی۔

چھوڑو ٹیکسی کو آؤ بیٹھو۔

فرخندہ بھی بول پڑی۔

آجاؤ کنول۔ ہم نے بھی تو ادھر ہی سے گزرنا ہے۔

کنول توقیر کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

اس بار تو شکریہ۔ پھر کبھی آپ کو تکلیف دوں گی۔

ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔ انیس نے بھی کار اس کے پیچھے لگادی۔ وہ کچھ
سا ہو گیا تھا۔ ونڈ سکرین میں سے سامنے ٹیکسی پر نظریں گاڑھے ہی گاڑھے ا
فرخندہ سے پوچھا۔

یہ کنول اس توقیر کو کب سے جانتی ہے۔

فرخندہ نے فکریہ لہجہ میں کہا۔

میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔ پارٹی کے دن برجیس نے مجھے کہا تھا ک
کوئی اچھا لڑکا نہیں۔ خبر نہیں کیسے اس نے کنول سے واقفیت نکال لی تھی

"تم کنول سے پوچھنا تو ——"

"نہیں یہ تو بری بات ہے۔ کیا سوچے گی وہ کہ میرے ذاتی معاملات
اندازی کرنے لگے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو میں اسے کسی دوسرے کے ساتھ برداشت نہیں کرسکتا
اس سے بات نہیں کرسکتی تو میں امی جان سے کنول کے ساتھ شادی کی بات

اس قدر بے تاب کیوں ہو رہے ہیں آپ۔ وہ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی ایم بی بی
کرلے تو بھابی بنا کر کان سے پکڑ کر اپنے گھر لے آؤں گی۔"

"اگر وہ پہلے ہی اس کی طرف مائل ہو گئی پھر؟"

کیوں تنگ دل ہوتے جا رہے ہیں۔ لڑکیوں کے دوست اور ملنے والے تو ہوتے
ہی ہیں۔ ضروری تو نہیں وہ انہی سے شادی کریں۔ اس قدر ہی اگر آپ خائف ہیں۔ تو
میں کسی دن اسے اپنے گھر لاؤں گی اور امی کو دکھا کر شادی کی تاریخ مقرر کرلیں گے۔"

"کنول اتنی جلدی مان جائے گی کیا۔"

"مانے گی کیسے نہیں۔ لڑکیاں آج کل تو زیادہ پڑھتی ہی اس لیے ہیں کہ کوئی مالدار
شوہر مل جائے اور کنول کو اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے۔ بہترین کوٹھی اور لاکھوں کا اپنا
کاروبار کرتا ہوا آپ جیسا شوہر، وہ تو ہوں ہاں کیے بغیر ہی مان جائے گی۔"

انیس خوش ہو گیا۔ ایک بار مسکرا کر فرخندہ کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے سامنے ٹیکسی پر
نگاہیں جمادیں جس کی پچھلی سیٹ پر توقیر اور کنول اکٹھے بیٹھے تھے۔ کچھ فاصلے تک وہ دونوں
خاموش رہے۔ پھر کنول نے ہی بولنے میں پہل کی۔

"امی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ آپ کتنے دنوں سے آئے ہی نہیں۔"

بہت کوشش کی آنے کی۔ جب چاہتا تھا آؤں کوئی نہ کوئی مشغولیت نکل آتی
تھی۔ ابھی ان کی صحت کیسی ہے ——"

کنول اداس ہو گئی

ویسی ہی ہیں بہت علاج کرایا ہے۔ کوئی افاقہ ہی نہیں ہو رہا ——"

توقیر چپ سا ہوگیا۔

کنول نے پھر سکوت توڑا۔

"یہ کیا ہے اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا ——"

"تصویر ہے۔ ایک دوست نے فرمائش ڈالی تھی ——"

کنول اسے گھورنے لگی۔ یہ تو بہت اچھی تصویر ہے۔ کمال کر دیا ہے کسی نے بڑا سین پیش کیا ہے۔ کس سے بنوائی ہے آپ نے۔

"میرا ایک دوست بناتا ہے۔"

کنول نے ذرا ہچکچاتے ہوئے کہا

"ایک مجھے بنوا دیجئے پھر ——"

"بنوا دوں گا۔"

"کب —— ؟"

"بہت جلد —— !"

"روک دو بھئی یہاں"۔ توقیر تیزی سے بولا۔

"ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی ——"

"اترو کنول ——"

دونوں نیچے اترے۔ توقیر نے بل ادا کیا۔ ٹیکسی چلی گئی اتنی دیر میں انیس کی کار آکھڑی ہوئی۔

"اچھا کنول میں چلتا ہوں"۔ توقیر نے قمیض کے کالر درست کرتے ہوئے کہا

"کہاں چلے ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کے امی جان کو تو ملتے جائیں۔"

"مجھے ایک بڑا ضروری کام ہے۔ پھر کسی دن آؤں گا۔"

اتنی دیر میں انیس اور فرخندہ بھی کار سے اتر گئے۔ کنول نے ابھی تک ان کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ فرخندہ نے خود ہی اسے اپنی طرف راغب کر لیا۔

"کنول! چائے نہیں پلاؤ گی۔"

کنول مسکرا دی۔

"ضرور پلاؤں گی۔ چلیئے اندر بیٹھتے ہیں چل کے۔"

وہ پھر توقیر سے مخاطب ہوئی۔

"چلئے نا آپ بھی! زیادہ دیر نہ بیٹھئے۔ چائے پی کے چلے جائیے گا۔"

توقیر ایک طرف چل دیا۔

"چائے ضرور پیوں گا۔ لیکن ابھی نہیں۔ پھر کبھی۔ مجھے اسی وقت ایک جگہ سخت ضرورت کے تحت جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

وہ آگے بڑھ گیا۔

کنول منہ بسورنے لگی۔

"کوئی ضروری کام نہیں۔ جھوٹ کہہ رہے ہیں آپ۔ امی سے آپ کی شکایت کروں گی"

کنول کچھ افسردہ سی ہوگئی۔

فرخندہ نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسے اُبالی قسم کے لڑکے کی کیا شکایت کرو گی۔ امی کے پاس۔ یہ تو ہوتے ہی ایسے

ہیں۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ بس یہی زندگی کا کارواں"۔

کنول نے ذرا گہری نگاہوں سے گھورا۔

انیس نے موقع اچھا جانتے ہوئے گرہ لگائی۔

اور کیا ایسے چالاک اور چھبیلے کو کسی کی کیا پرواہ۔

کنول کو دونوں بھائی بہن کی باتوں پر غصہ آگیا۔ لیکن پی ہی گئی بے چاری فرخندہ نے موقع محل اچھا جانا اور پوچھ ہی لیا۔

اس سے تمہاری ملاقات کیسے ہوگئی کنول!

یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اندر بیٹھ کے سناتی ہوں۔ ویسے مختصراً بڑا اچھا لڑکا ہے

فرخندہ اس جواب پر چپ ہو رہی۔

تینوں مکان میں داخل ہوئے انیس اور فرخندہ آداب کہتے ہوئے پلنگ پر لیٹی ہوئی جمیلہ کے پاس بیٹھ گئے۔ کنول دوسرے کمرے میں گئی پہلے لباس تبدیل کیا ہیٹر آن کر کے چائے بنانے لگی۔

توقیر پیدل چلتا ہوا بازار گیا اور تصویروں کی دوکان میں داخل ہوا۔ شاکر بڑی خندہ پیشانی سے ملا۔ چند فقروں کی رسمی باتوں کے بعد شاکر نے دو سو روپیہ نکالا۔ اور توقیر کی طرف بڑھایا۔

"کئی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ روپے تمہیں کیسے پہنچاؤں۔ مجھے تو تمہارے گھر کا بھی پتہ نہیں۔ اچھا ہوا آج تم خود ہی آگئے۔"

توقیر نے حیرت سے پوچھا۔

"لیکن میری تو صرف ایک ہی تصویر تھی آپ کے پاس۔ دو سو روپیہ کیسے نکل آیا۔"

"وہ لڑکی جو تمہاری تصویریں لے جاتی ہے دو سو روپے دے گئی ہے۔ سو روپیہ اس تصویر کا جو پہلے سے میرے پاس تھی اور سو اس کا جو ابھی لے کر آئے ہو۔"

"اس کا بھی دے گئی۔" توقیر نے استعجاب سے پوچھا۔

"ہاں اسے تمہاری تصویریں بہت پسند ہیں۔ اگلی تصویر کے لیے وہ ایڈوانس بھی د
گئی تھی۔ میرے خیال میں آنے ہی والی ہوگی۔ کہہ گئی تھی آج آنے کے لیے۔"

توقیر نے تصویر کونٹر پر رکھ دی۔ اور روپیہ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"اچھا میں پھر چلتا ہوں۔"

"بیٹھو چائے منگواتا ہوں۔ پیتے جاؤ۔"

"نہیں شکریہ ایک جگہ جلدی اور ضروری جانا ہے۔"

توقیر دوکان سے باہر آیا۔ شام ہوگئی تھی اور اندھیرا پھیلنا شروع ہو چکا سیاہ گو
گہرا اندھیرا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ میوہ منڈی آیا اور جلدی جلدی آموں کی اکھانچ
کر رکشا میں رکھی اور ریلوے کالونی کی طرف چل پڑا۔ جمیلہ کے مکان کے پاس وہ اُ
کی اوٹ میں بیٹھ کر کھانچی کے ساتھ لٹکتی ہوئی سُتلی میں سو روپیہ کا ایک نوٹ باندھا او
کھانچی اٹھا کر جمیلہ کے مکان میں دیوار کے اوپر سے پھینک دی۔

کنول کھانا کھانے کے بعد صحن میں ہاتھ دھو کے کلّی کر رہی تھی کہ کھانچی دھڑ
صحن میں گری۔ خوف کے مارے وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ جمیلہ نے جا اسے گھبرائے ہ
دیکھا تو کسی قدر تشویش سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بیٹی؟"

کنول نے اونچی اونچی سانسوں میں کہا۔

"امی! آج پھر کسی نے ہمارے ہاں کوئی چیز پھینکی ہے۔ میرا تو دل ہی دہ

"تم نے باہر نکل کے دیکھا تو ہوتا۔ کون تھا۔"

"ڈر لگتا ہے امی!"

جمیلہ نے ذرا سا مسکرا کے کہا۔

"تم تو کہا کرتی ہو امّی! میں تمہاری بیٹی نہیں بیٹا ہوں۔ جب تم ہی اس طرح ڈرنے
لگیں تو میرا پھر کیا ہوگا۔"

کنول نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کچھ سوچا۔

اچھا۔

پھر بڑے پیارے انداز میں مردوں کی طرح اپنی آستینیں چڑھاتی ہوئی بولی۔

"ابھی پتہ کرتی ہوں امّی! کون تھا سامان پھینکنے والا۔"

بڑی تیزی سے وہ باہر آئی۔ گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا کوئی بھی تو نہیں تھا۔
اور پھر واپس آگئی۔

"باہر تو کوئی نہیں امّی! پتہ نہیں کون پھینکتا ہے سامان۔"

"پھینکا کیا ہے یہ تو دیکھو۔"

"ابھی اٹھا کے لاتی ہوں۔"

کنول کھانچی اُٹھا کر اندر لے آئی اور جمیلہ کے پاس رکھ کر اوپر سے کاغذوں کی
تہ ہٹا دی۔ "یہ تو آم ہیں امّی! بڑے اچھے ہیں۔ دیکھو تو کیسی خوشبو آ رہی ہے۔"

وہ اونچے اونچے سانس کھینچ کر سونگھنے لگی۔

جمیلہ مسکرا دی۔

"تمہارے منہ میں تو پانی بھی آگیا ہے۔"

"نہیں تو۔"

"ارے امی یہ دیکھو۔"

"کیا ہے ؟"

"یہ دیکھو تتلی میں سو روپیہ کا ایک نوٹ بھی بندھا ہوا ہے۔"

"سو روپیہ۔"

"ہاں تو۔ دیکھ لو بیشک۔"

"کون ہے یہ سمجھ نہیں آ رہی۔"

"امی! تمہارے خیال میں یہ کون پھینکتا ہے۔"

جمیلہ نے ذرا سوچ کے کہا۔

"میرا دل تو کہتا ہے یہ کام توقیر ہے۔"

کنول اچھل پڑی۔

"بالکل ٹھیک کہا امی! میرا خیال بھی یہی ہے جب سے وہ ہمارے آنے لگے ہیں۔ یہ چیزیں گرنے لگی ہیں پہلے تو کبھی کسی نے کوئی چیز تھی۔"

"لیکن اس دن جب پوچھا تھا تو وہ انکار کر گیا تھا۔"

"ایسے تھوڑا ہی مانتا ہے وہ۔ ویسے تمہارے خیال میں کیسا لڑکا ہے؟"

اچھا ہے۔ بہت اچھا۔ کسی شریف خاندان اور نیک ماں کا سلجھا اور ہونہار بچہ ہے۔ خدا اسے لمبی عمر دے۔"

"آمین۔ تم نے ٹھیک کہا امی! بہت اچھا ہے۔ آج میں چوک پر بس کے انتظار میں کھڑی تھی تو وہ بھی ادھر سے گذرے مجھے اکیلے کھڑے دیکھا تو ٹیکسی میں بٹھا کر یہاں چھوڑ گئے۔"

"تم نے پہلے تو ذکر نہیں کیا۔"

"یہ خیال ہی نہیں گزرا۔"

"تم اسے اندر تو لاتیں۔"

"میں نے تو بہت کہا۔ لیکن ایک ضروری کام کا کہہ کر بھاگ ہی گئے۔"

جمیلہ خاموش ہو گئی۔

"یہ نوٹ پھر لے لو امی!"

"اپنے پاس ہی رکھ لو۔"

ٹوکری پھر یہیں پڑی ہے۔ میں پڑھنے لگی ہوں۔

اپنے کمرے میں جا کر وہ کتاب اٹھا لائی اور جمیلہ کے پاس ہی بیٹھ کر پڑھنے لگی۔

صبح کالج جانے کے لیے جب وہ اپنا اور آل درست کرتی ہوئی گھر سے نکلی تو سامنے سڑک کے کنارے انیس کی کار کھڑی تھی اور وہ سر باہر نکالے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کنول جب کچھ آگے بڑھی تو وہ دور سے ہی بولا۔

"بہت دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔"

کنول نے پریشانی سے پوچھا۔

"کہیے اور فرخ کہاں ہے؟"

"اس کی تو صحت آج ٹھیک نہیں ایپلیکیشن لایا ہوں اس کی"

"لائیے میں لے جاتی ہوں"

"وہ تو میں خود بھی لے جاؤں گا۔ تم بیٹھو کالج چھوڑ آؤں نہیں"

"شکریہ! میں چلی جاؤں گی۔ آپ کیوں زحمت اُٹھاتے ہیں"

"زحمت کاہے کی۔ میں تو کتنی دیر سے تمہارے ہی انتظار میں کھڑ

بیٹھو" اس نے کار کا اگلا دروازہ کھول دیا۔ کنول نے بھی سرِ عام سڑک پر اور تکرار اچھا نہ سمجھا اور کار کے پچھلے دروازے کی طرف بڑھی۔

"وہ لاک ہے" انیس نے جھٹ کہا۔ "اِدھر ہی آجاؤ"

مجبوراً وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

بازار میں سے گذرتے ہوئے اس نے کار ایک کیبن کے پاس روک کر چتونوں سے کنول کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا پیو گی

"بینز۔ کوکاکولا۔ شیزان۔ فانٹا۔ سیون اپ"

کنول جھنجھلا گئی۔

"نہ آپ نہ ڈاؤن۔ کچھ بھی نہیں۔"

"کیوں؟" اس نے پھر شوخی سے پوچھا۔

کنول نے قدرے بیزاری سے کہا۔

"کالج سے دیر ہو رہی ہے۔ آپ وہاں تک پہنچا دیجئے۔ یہی آپ

ہے۔"

"صرف پانچ منٹ" وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

دو بوتلیں اٹھائے وہ واپس آیا۔ کار سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ اَن گنت لوگ گزر رہے تھے۔ سکول کو جاتے بچے، بچیاں۔ کالج کے جوان لڑکے لڑکیاں دفتروں کو جاتے ہوئے وکیل۔ فیکٹریوں اور ملوں کو جاتے ہوئے مزدور پیشہ غریب لوگ کئی خالی ہاتھ ہی تھے۔ کچھ رنگ برنگ کے ٹفن کیریر اٹھائے جا رہے تھے۔

کنول نے خاموشی سے بوتل لے لی۔ دونوں آہستہ آہستہ سپ کرتے ہوئے ونڈ سکرین میں سے یونہی اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ بوتلیں خالی ہو گئیں اور انیس واپس دے آیا۔ کار پھر آگے بڑھی۔ کالج کے گیٹ کے پاس انیس نے کنول کو اتار دیا اور وہ شکریہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

سہ پہر کو جب وہ کالج سے نکلی تو انیس گیٹ کے پاس کھڑا تھا۔ کنول کو خواہی ناخواہی سلام کرنا پڑا۔ اس نے بڑی شگفتہ روی سے ذرا جھکتے ہوئے اپنی کار کی طرف اشارہ کیا۔

"چلئے چلیں۔"

کافی لڑکیاں گیٹ سے نکل رہی تھیں۔

کنول اس کے ساتھ کار کی طرف بڑھ گئی۔ انیس نے بڑے پیارے انداز میں کار کا اگلا دروازہ کھولا اور پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ کنول کو اس کی اس حرکت پر ہنسی آگئی۔ جسے وہ روکتی ہوئی اندر بیٹھ گئی۔ انیس نے دروازہ بند کیا۔

اور کار اسٹارٹ کر دی۔

بازار سے گزرتے ہوئے اس نے کار پھر روک دی۔

"کیا کھایا جائے؟"

"کچھ نہیں"۔ کنول نے دھیرے سے کہا۔

"کچھ تو کھایا جائے گا۔ میں کھلاتا ہوں یا تم کھلاؤ۔"

"کیا کھائیں گے؟"

"پیسے ہیں تمہارے پاس"

"ہاں"۔ کنول نے پرس سے پانچ کا ایک نوٹ نکال لیا۔

نوٹ لے کر انیس باہر نکل گیا۔ ایک دوکان میں گھس کر کچھ خریدا۔ پھر آیا اور ڈھیر سے چاکلیٹ کنول کے پاس رکھتے ہوئے پانچ کا نوٹ بھی اس میں پھینک دیا۔

"کھائیے۔"

کنول نے نوٹ اٹھایا۔ سفید گول دائرے کے اندر انیس نے اپنا کام

گھر کے پاس انیس نے اسے اُتارا۔ کنول جب آگے بڑھی تو انیس نے نکالتے ہوئے ہلکے سے کہا۔

"بہت بے حرص ہو۔"

"کیسے؟" واپس مڑتے ہوئے کنول نے پوچھا۔

"اتنا بھی نہیں کہا کہ آؤ چائے ہی پی لو۔"

"خیال نہیں رہا۔ آئیے۔"

"نہیں شکریہ پھر کبھی"۔ کار سٹارٹ کر کے وہ چلا گیا۔

کنول جب گھر داخل ہوئی تو توقیر اس وقت وہاں سے نکل رہا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے باہر آرہا تھا۔ دونوں بڑی مشکل سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"بڑی تیزی سے بھاگے جا رہے ہیں"۔ کنول نے پوچھا۔

"بہت دیر ہوئی آئے ہوئے۔ کوئی کام کر دوں گا جا کے اب"۔

"بغیر پیچھے کام چھوڑے بھی کبھی آئے ہیں آپ"

توقیر نے بلا جھجک کہہ دیا۔

"غریب آدمی ہوں زندگی بسر کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

کنول، اس کی صاف گوئی پر خوش ہو گئی۔ ورنہ آج کل کے لڑکے بالخصوص لڑکیوں کے سامنے اپنی بڑھائی میں زمین آسمان ایک کر دیتے ہیں۔

کنول اس کی باتوں پر اداس ہو گئی۔

"کیا کرتے ہیں آپ۔ بس پڑھنا ہی ہو گا——"

نہیں محترمہ! زندہ رہنے کے لیے ہزاروں جتن کرنے پڑتے ہیں۔ یہ زمانہ بڑا بے رحم ہے تنور میں آگ جلتی رہے تو ہی گرم رہتا ہے۔ یہی حساب کچھ انسانی پیٹ کا بھی ہے۔ سمجھ گئیں آپ"

کنول نے دُکھ سے کہا۔

"سمجھی۔ آپ کی باتیں بہت اونچی ہیں"

"اونچی نہیں سیدھی ہیں۔ غریب کو پیٹ کا ایندھن بڑی مشکل اور جدوجہد کے بعد
آتا ہے اور ایسی محنت کے بعد جو سکون ملتا ہے اس سے اہل دولت نا آشنا ہیں
آپ ہی بتائیے کیا اونچی بات ہے اس میں، ہاں سیدھی ضرور ہے۔"

کنول نے درد آمیز لہجے میں پوچھا۔

"آپ کے ابّو کیا کرتے ہیں؟"

"قبر میں سو رہے ہیں۔"

کنول نے سر جھکا لیا۔

اس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

توقیر باہر نکلنے لگا۔

"جاؤ منی تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ کھانا کھاؤ جاکر۔"

"جی۔"

اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے اس
سے گر پڑے۔

توقیر جا چکا تھا۔

کنول نے آنکھیں دوپٹے کے پلّو سے پونچھ لیں۔

بوجھل بوجھل قدموں سے وہ آگے بڑھی۔ توقیر کی باتوں سے اس کے ذ
ہتھوڑے چل گئے تھے۔

"امیر، غریب۔"

"غریب، امیر"

"کیا چکر ہے دنیا کا"

ملوں اور فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور غریب۔

دفتروں میں کام کرنے والے بابو غریب۔

کالج اور سکول کے استاد غریب۔

مسجدوں کے پیش امام غریب۔

سب غریب ہی غریب۔

امیر صرف چند گھرانے جنہیں سکون میسر ہے۔

باقی سب غریب۔

غریب، دکھ، غم، تکلیف، بیماری اور بھوک کے ساتھی۔

لڑکھڑاتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ کتابیں میز پر پٹخ کر وہ کرسی پر گری
پڑی اور آنکھیں موند لیں۔

امتحان ہوئے اور ختم ہو گئے۔

رزلٹ نکلا اور توقیر بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن پاس کر گیا۔

سردی خوب زوروں کی ہو گئی تھی۔ بچارے غریب لوگوں پر مصیبت آ
تھی۔ بازار سے کوئلہ اور لکڑی خرید کر گھروں کو گرم رکھنا کس قدر مہنگا اور مشکل
اخباروں میں اکثر پڑھنے میں آتا کہ کوئی بھکاری رات فٹ پاتھ پر سردی سے
کر مر گیا۔ غریب مزدور لوگ سڑکوں پر خزاں رسیدہ درختوں کے سوکھے پتے
کر کے جلانے لگے۔ مجبوری تھی زندہ رہنے کا سامان کسی نہ کسی طرح مہیا تو کرنا ہے

توقیر آج پھر جب جمیلہ کے گھر کچھ سامان پھینک کر گھر داخل ہوا تو ساجد
قیصر بیٹھا ہوا تھا۔ توقیر کو دیکھتے ہی قیصر نے ساجدہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"لو ماں جی! وہ آ ہی گیا ہے۔ اب آپ مجھے اپنا پکا فیصلہ دیں۔"
ساجدہ نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے ذرا سوچ کے کہا۔
"مجھے یہ جوڑ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کہاں برجیس اور کہاں توقیر۔ بہت فرق ہے۔"

قیصر نے بیتابی سے پوچھا۔

"پتہ تو چلے نا کیا فرق ہے۔"

"امارت اور غربت کا فرق۔"

"تعلیم کا فرق ہے۔ توقیر بی۔ اے ہے اور برجیس ایم بی بی ایس۔ شادی کے بعد
دونوں کا نبھا ہو جائے گا کیا؟"

"سب کچھ ہو جائے گا۔ میں ہر کام برجیس کی خواہش اور رضامندی پر ہی کر رہا ہوں
اتنا پاگل نہیں کہ اس سے پوچھے بغیر ہی اس کی شادی کر ڈالوں۔ توقیر کے ساتھ شادی
کا اس نے خود اپنی زبان سے اظہار کیا ہے۔ آپ صرف ایک بار ہاں کہہ دیں۔"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں توقیر سے پوچھ لو۔"

"اسے تو میں نے پرسوں بڑی مشکل سے رضامند کر ہی لیا ہے۔"

"پھر بھی کچھ دن اور سوچ لو۔ اتنے دنوں تک میں بھی ہو سکتا ہے ٹھیک ہو جاؤں
آج مہینہ ہو گیا ہے۔ اس بیماری نے تو مجھے زیادہ ہی نزار کر دیا ہے۔"

بہت سوچ چکا ہوں۔ اب میرے پاس وقت نہیں۔ آج سوموار ہے اور میں
نے ہفتے کے روز ایف آر سی ایس کرنے کو فارن کے لیے فلائی کر جانا ہے شادی کا
بالکل کوئی اہتمام نہیں ہو گا۔ میرا ارادہ ہے خاموشی کے ساتھ جمعرات کو نکاح ہو جائے

اور جمعہ کو یہ دونوں میرے ساتھ کراچی روانہ ہو جائیں ۔ ایک تو یہ دونوں مجھے
سی آف بھی کرلیں گے ۔ دوسرے ایک مہینہ وہاں رہ کر واپس آجائیں گے
نے اپنی کراچی والی کوٹھی ان دونوں کے لیے ابھی سے خالی کرالی ہے۔" "م
تمہارے ہاں تک بھی نہ جا سکوں گی۔

"کوئی ضرورت بھی نہیں آپ کے جانے کی ۔ میں جمعرات کو آکر توقیر
جاؤں گا وہیں نکاح ہوگا اور پھر میرے ساتھ چلا جائے گا ۔ برجیس نے خود
سے کہا ہے کہ بالکل خاموشی سے شادی ہو ۔ کسی قسم کے چرچے اور پارٹیوں
ویسے بھی یہ سب فضول ہے ، جو روپیہ ان پارٹیوں کی نظر ہوتا ہے وہی
میاں بیوی مستقبل میں اپنے کام میں لا سکتے ہیں ۔ لیکن ہمارے ملک میں ج
بار چل جائے خواہ وہ درست ہو یا اندھی ، اس کا روکنا اور ختم کرنا ناممکن
جاتا ہے ۔ اسی لیے تو ہمارا ملک ترقی نہیں کرپاتا ۔ بس جو کمایا شادیوں کی نظ
بعض گھرانے تو ہزاروں کا قرض سر پر چڑھا لیتے ہیں ۔ لیکن رسمیں پوری
سمجھتے ہیں اور ان کے لیے عجیب عجیب جواز بھی پیش کرتے ہیں ۔

ہماری ناک کٹ جائے گی ۔

برادری یا گاؤں والے طعنہ دیں گے ۔

باپ دادا کی روحیں بے چین ہو جائیں گی وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن یہ نہ
گھر برباد ہو جائے گا ۔ دونوں میاں بیوی شادی کے فوراً بعد ہی قرض ا
کی فکر میں لگ جائیں گے اور ـــــ ساجدہ نے اس کی بات کاٹ د

" چھوڑو ان باتوں کو بیٹا ! ہمیں اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں جو تمہارے جی
میں آئے کرو ۔" قیصر کھڑا ہو گیا ۔

" بس ماں جی ! شکریہ ۔ میں اب چلتا ہوں ۔ برجیس اور توقیر کے کپڑوں کا بندوبست
کرنا ہے ۔" قیصر باہر نکل گیا ۔

جمعرات کو خاموشی کے ساتھ نکاح ہو گیا ۔

رات جب توقیر حجلۂ عروسی میں داخل ہوا تو پھولوں سے تکلف کی حد تک سجے
پلنگ پر برجیس گٹھڑی بنی پڑی تھی ۔ لرزتے قدموں سے توقیر آگے بڑھ کر پلنگ پر ہو
بیٹھا ۔ اور ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر اٹھایا ۔

" برجیس "

"جی ! " اس نے اپنی آنکھیں موندھ رکھی تھیں ۔ اس کا حسن اس طرح چمک
رہا تھا ۔ جیسے کسی نے اندھیرے میں سینکڑوں کنول روشن کر دیئے ہوں ۔

" میری طرف دیکھو برجیس ! " توقیر نے بڑے پیار سے کہا ۔

برجیس نے آنکھیں کھول دیں ۔

" اُف ! "

غصے سے اس کا چہرہ نفرت آمیز ہو گیا ۔

آنکھیں جو پہلے شرم و حیا کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں سرخ ہو گئیں ۔

پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں ۔

غصے میں کانپتے ہوئے اس نے جھرجھری لی ۔

توقیر نے پیار سے پوچھا۔

"کیا ہوا برجیس ؟"

برجیس نے غصّے میں کہا۔

"سوچتی ہوں میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی"

"نہیں برجیس یہ حقیقت ہے۔"

"ہاں حقیقت ہی ہے لیکن بہت تلخ۔"

"کیوں ؟"

"اس لیے کہ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔"

"برجیس" وہ اور تلملا گئی۔

"مجھے تم سے نفرت ہے۔ سخت نفرت۔ میں تمہیں اپنے شوہر کے روپ دیکھ سکتی۔ چلے جاؤ یہاں سے میں کہتی ہوں اُٹھ جاؤ۔ میں ابھی بھائی جا بات کرتی ہوں۔ انھوں نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔" وہ غصّے میں اُٹھ کھڑی دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کے بھرے بھرے جسم پر سرخ غرارہ سوٹ پر سنہری اور سفید تاروں میں کیا ہوا کام۔ اللہ توبہ اسے حور تمثال اور پری تمثا

توقیر ابھی تک کسی گہری سوچ میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ برجیس جب باہر نک برق کی سی تیزی سے اُٹھا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

برجیس اور بگڑ گئی۔

"ہٹ جاؤ پیچھے!"

توقیر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

برجیس باہر جانے سے پہلے میری ایک بات سُن لو۔ تمہارا بھائی پرسوں جانے والا ہے۔ اُسے یہ سُن کر سخت تکلیف ہو گی۔ اس کے علاوہ میری ماں بیمار ہے اس کو جب ان حالات کی خبر ہو گی تو وہ بچ نہ سکے گی۔ یہ صدمہ اسے قبر تک پہنچانے کے لیے کافی ہو گا۔ میری تم سے التجا ہے کہ تم صرف ایک ماہ خاموش رہو۔ میری ماں ہو سکتا ہے تندرست ہو جائے۔ تمہارا بھائی بھی چلا جائے گا۔ پھر میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ اس ایک ماہ میں ہم میاں بیوی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ظاہراً دو دوستوں اور حقیقتاً دو اجنبیوں کی طرح رہیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں اس عرصے کے دوران میں تمہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

توقیر نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔

"اب بھی اگر تم باہر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گا۔"

وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

برجیس واپس مڑی اور بستر پر گر گئی۔

توقیر نے شبِ عروسی کے دوہرے پلنگ سے ایک بستر اٹھایا اور کمرے کے دوسرے کونے پر پڑے ہوئے ایک صوفے پر لگا کر سو گیا۔

اگلے روز تینوں کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ ہفتے کے روز وہ وہاں پہنچے اور نرسری میں ایک جدید طرز کی خوش رنگ و خوش نما کوٹھی میں قیام کیا۔ قیصر ایک رات ان کے ساتھ رہا اور دوسرے دن دوپہر سے کچھ پہلے وہ دونوں اسے سی آف کرنے

کے لیے ائیرپورٹ پر کھڑے تھے۔ پی۔آئی۔اے کا بھاری بھرکم جہاز فضاؤں میں اُڑ کر اُوجھل ہو گیا اور وہ دونوں ٹیکسی سے واپس آئے کرایہ توقیر نے ادا کیا۔

برجیس واپس آکر آرام کرنے کو لیٹ گئی۔ دونوں کے بستر ایک ہی کمرے میں تھے۔ کوٹھی کا ملازم جو مالی بھی تھا۔ پھول دار پودوں کی گوڈائی کر رہا تھا اور اس کی بیوی چائے بنا رہی تھی۔ توقیر کرسی کھینچ کر دھوپ میں ہی بیٹھا۔ ملازمہ نے اسے چائے لاکر دی اور وہ پینے لگا۔ جس طرح چائے سے ہلکا ہلکا گرم دھواں اُٹھ رہا تھا۔ اسی طرح اس کے ذہن میں گوناگوں خیالات اور وسوسے بھاپ بن بن کر اُٹھ رہے تھے۔

پیالی خالی کر کے اس نے کرسی کے پاس ہی رکھ دی۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

گزرے ہوئے واقعہ کی۔

آنے والے خدشات کی۔

اسے اپنا مستقبل دھندلا دھندلا سا دکھائی دینے لگا تھا۔

کیا سوچا تھا کیا ہو گیا۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ بس یہی کچھ تھا مقدر میں،

ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اس نے سر جھکا لیا۔

اس کا سر بھاری ہو گیا تھا۔

سوچیں اُلجھ گئی تھیں۔ آکاش بیل کی طرح۔

اُف!

لمبا سانس لے کر اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

اُسے سکون چاہیے تھا۔

"سکون۔"

جو غریبوں میں سے بہت کم کو نصیب ہوتا ہے۔

کچھ سوچ کر وہ اُٹھا اور کوٹھی سے باہر سڑک پر آکھڑا ہوا بسیں گزر رہی تھیں ہی تیزی سے اس نے اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ ساٹھ روپے اور کچھ ریزگاری تھی۔ س اجنبی شہر میں وہ احتیاط برتنے کا عہد کرتا ہوا بس سٹاپ کی طرف بڑھنے لگا۔

یک بس آکر وہاں کھڑی ہوئی اور وہ لپک کر اس میں بیٹھ گیا۔

وقت کاٹنے کی خاطر وہ اِدھر اُدھر آوارہ گردی کرتا رہا۔

کلفٹن گیا ہوا بندر گھوما، کیماڑی کا چکر لگایا، منوڑا گھومتا رہا۔

قریب شام وہ صدر آیا اور ایک درمیانہ درجے کے ہوٹل میں کھانا کھایا تین روپے پچھتر آنے اس نے بھی دے لیے۔

جب وہ واپس لوٹا تو اندھیرا خوب پھیل چکا تھا۔ برجیس ٹیبل لیمپ کی روشنی میں بار خواتین پڑھ رہی تھی، دبے دبے پاؤں سے وہ اندر آیا۔ برجیس نے دردیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ پھر پڑھنے لگی۔ توقیر نے کوٹ اور پتلون اُتار کر الگنی پر لٹکائے اور جامے قمیض میں ہی رضائی میں گھس کر لیٹ رہا۔

تھوڑی دیر بعد ملازمہ آئی۔

"صاحب کھانا لاؤں؟"

رضائی سے منہ نکالے بغیر ہی اُس نے کہا۔

"نہیں میں کھا آیا ہوں۔"

ملازمہ نے برجیس کی طرف دیکھا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ مایوس ہو کر وہ با
نکل گئی۔

وہ رات بھی بیت گئی۔

صبح وہ دھوپ میں بیٹھا تھا کہ اخبار والا اخبار دے گیا۔ اُلٹ پلٹ کر وہ پڑ
لگا۔

اتنی دیر میں ملازمہ آئی اور تین سو روپیہ اسے تھما دیا۔

"بیگم صاحبہ نے دیے ہیں۔"

توقیر نے لے لیا۔

ملازمہ جب چلی گئی۔ وہ اُٹھ کر اندر آیا۔ برجیس آئینے کے سامنے کھڑی بال
رہی تھی۔ توقیر نے نوٹ اس کے سامنے پھینک دیے اور باہر نکل گیا۔ بس
وہ صدر آیا اور فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا کدھر جائے۔

بسوں والے ہانک لگا رہے تھے۔

"صدر۔ بندر روڈ۔ ڈینسو ہال۔ بولٹن مارکیٹ۔ ٹاور۔ کیماڑی۔ کیماڑی"

کوئی اور بولا۔

"جہانگیر روڈ۔ گرومندر۔ تین ہٹی۔ لسبیلہ۔ گولی مار۔ ناظم آباد۔ چاپوش نگر

ایک اور چلّایا۔

"جیکب لائن۔ نرسری۔ سوسائٹی۔ ڈرگ روڈ۔ ملیر۔ بھینس کالونی۔ لانڈھی۔ کورنگی
کورنگی"

وہ آگے بڑھ گیا۔ فٹ پاتھ پر لوگوں نے طرح طرح کی دوکانیں لگا رکھی تھیں۔

عینک اور پین بیچنے والے۔

بنیان اور تولیے والے۔

پرانے انگریزی اردو ناولوں اور رسالوں والے۔

دہی بڑے اور چنے والے۔

خشک پھل والے۔

ایک طرف پرانے کوٹ بیچنے والے بیٹھے تھے۔

گھڑی اور پین پر نام لکھنے والے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گاہک پھانسنے کی کوشش
کر رہے تھے۔

سب لوگ اپنے اپنے دھندے میں لگے ہیں۔ میں ہی بیکار ہوں مجھے بھی
کچھ کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا سروس تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر مل گئی
تو یہیں رہ جاؤں گا۔ بندر روڈ سے وہ میکلوڈ روڈ پر آیا۔ اور ایک فرم کے آفس میں
داخل ہوا۔ اندر پتہ نہیں کوئی مینجر یا اکاؤنٹنٹ بیٹھا تھا۔ توقیر جب اندر داخل ہوا
اس نے عینک اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے جوان؟"

توقیر ہچکچایا۔

"کہو بھئی وقت ضائع نہ کرو۔"

"جی۔ سروس کے لیے حاضر ہوا ہوں۔"

"ہوں۔ کیا تعلیم ہے؟"

"گریجویٹ۔"

"چہ چہ چہ۔ مشکل بہت مشکل۔ آج کل تو فٹ پاتھ پر چنے، پان، سگریٹ، بیڑی بیچنے والے حتیٰ کہ پالش کرنے والے گریجویٹ ہیں۔ ہمارے پاس کوئی ویکنسی نہیں۔ سوری۔"

توقیر باہر نکل گیا۔

شام تک وہ بندر روڈ اور میکلوڈ روڈ کی مختلف فرموں اور دفتروں کے چکر لگاتا رہا پر ناکامی اور مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ شام کا کھانا ایک چھوٹے سے ہوٹل میں اس نے کھایا اور پھر سڑک کے فٹ پاتھ پر چل نکلا۔ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اس کے کان میں آواز پڑی۔

"چارپائی بستر دو روپے۔"

"صاف ستھرا بستر۔"

"آ بیٹھے بابو!"

واپس جانے کو اس کا جی نہ چاہ رہا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے تو اس کا دماغ پھٹ رہا تھا۔ ذہن الجھ جاتا تھا۔ اس نے سوچا رات یہیں گزار لوں۔ شاید سکون سے گزر جا

وہ ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔ مینجر نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"بابو جی! سنگل بستر یا ڈبل؟"

اس نے خیال کیا ڈبل اچھا رہے گا۔ زیادہ سے زیادہ تین یا چار روپے لے گا

"ڈبل" سوچ کے اس نے کہہ دیا۔

ملازم اسے ایک کمرے میں چھوڑ گیا۔ اندر ایک صاف ستھرا پلنگ لگا تھا۔ ایک کرسی اور بوسیدہ سا میز بھی پڑا تھا۔ کمرے کی سیم زدہ دیواروں کا سیمنٹ اکھڑ چکا تھا جس سے کمرے کی ہیئت بھدی سی ہو گئی تھی۔ ملازم واپس جانے لگا۔ توقیر نے اسے پیسے دیے۔

"ایک پیکٹ ریڈ اینڈ وائٹ لا دینا۔"

ملازم چلا گیا۔

کوٹ اتار کر اس نے دیوار کے ایک کیل پر لٹکا دیا اور بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا تھا کہ سانولی سی ایک لڑکی اندر آئی اور بڑی بے تکلفی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

توقیر نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟"

لڑکی نے تیز نگاہوں سے اُسے گھورا۔

"آپ نے ڈبل بستر نہیں مانگا تھا؟"

توقیر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

لڑکی اُٹھ کر چلی گئی۔

وہ غصّے میں بڑبڑایا۔

سماج کے چلتے پھرتے ناسور۔

ملازم سگریٹ لے آیا۔

"آپ نے اس لڑکی کو واپس کر دیا ہے" ملازم کے لہجے میں شکایت تھی۔

"ہاں۔ میں اس مطلب کے لیے یہاں شب بسر نہیں کر رہا۔

"آپ ہی نے تو ڈبل بستر مانگا تھا"

"مجھے تمہارے ان خفیہ فقرات سے واقفیت نہ تھی"

"چلئے پھر آپ بڑے کمرے ہیں"

"ہاں چلو۔ یہ تم لوگ کیوں معاشرے میں گند پھیلا رہے ہو"

"سب چلتا ہے صاحب"

ملازم اُسے بڑے کمرے میں لایا۔ دو قطاروں میں بارہ کے قریب چارپائیاں توقیر ایک بستر پر بیٹھ گیا۔ پہلے بوٹ اتارے۔ کوٹ پائے کے ساتھ لٹکا دیا اور پتلو کرکے تکیے کے نیچے رکھ لی۔ رضائی کھینچ کر وہ لیٹ گیا اور سگریٹ سلگا کر لمبے لگانے لگا۔

صبح وہ اُٹھ کر باہر آیا۔ شہر میں خوب ہنگامہ آرائی شروع ہو چکی تھی۔ ہر طرف شور تھا۔

بسوں کا، دوکانداروں کا، اخبار بیچنے والوں کا۔

سامنے والے ہوٹل میں ریڈیو پاکستان سے کسی مصری قاری کی تلاوت نشر

وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر سننے لگا۔ کتنا سکون تھا۔ ان الفاظ میں آواز کسی کی ایسی تھی کہ چاروں طرف موتی سے بکھر رہی تھی۔

تلاوت ختم ہوئی تو وہ آگے بڑھا۔ قریب ہی ایک ہیر کٹنگ سیلون سے اس نے شیو کرائی گرم پانی سے غسل کیا اور تازہ دم ہو کر باہر نکلا۔ اسی سامنے والے ہوٹل میں اس نے سوا روپیہ کا ناشتہ کیا اور سروس کی خاطر پھر چل نکلا۔ فریر روڈ سے وہ بندر روڈ آیا۔ پھر ریگل روڈ پر ہوتا ہوا میکلوڈ روڈ پر حبیٰ کہ ٹاور کے پل تک اس نے کئی جگہ قسمت آزمائی کی۔ لیکن بے سود۔ پھر واپس مڑا۔ گارڈن روڈ پر گیا۔ جہانگیر روڈ کا پرانی نمائش تک چکّر لگایا۔ لیکن ناکام۔

شام ڈھلے وہ واپس نرسری آیا۔ کمرے میں برجیس کھانا کھا رہی تھی۔ وہ اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ اتنے میں ملازمہ اندر آئی۔

"رات آپ کہاں رہ گئے صاحب؟"

توقیر نے جھوٹ بولا۔

"ایک دوست کے ہاں چلا گیا تھا"

"بتایا تو نہیں آپ نے ہم سب پریشان ہو رہے تھے"

"خیال نہیں رہا"

برجیس کے سامنے ملازمہ نے ایک کرسی اُٹھا کر رکھ دی۔

"آئیے بیٹھئے۔ میں ہاتھ دھلاتی ہوں آپ کے کھانا کھالیں"

"میں کھا آیا ہوں بڑی بی"۔ کوٹ اتار کر اس نے ہینگر پر رکھتے ہوئے کہا۔

ملازمہ نے برجیس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ کچھ نہ کہا۔ صرف ایک بار نظریں اُٹھا کر توقیر کی طرف دیکھا۔ ملازمہ کچھ نہ سمجھ رہی۔ بسورتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ توقیر لباس بدل کر بستر میں گھس گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ کراچی کی اس نے ایک ایک سڑک چھان ماری۔ مگر سروس کہیں نہ ملی۔ آج بھی وہ باہر گیا ہوا تھا۔ برجیس لان میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی کہ ڈاکیہ آگیا۔ برجیس اخبار چھوڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈاکیہ قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"یہاں کوئی توقیر صاحب ہیں؟"

"ہاں ہیں۔" برجیس نے کہا۔ "کیا بات ہے؟"

"ان کا تار ہے۔"

"مجھے ہی دے دو۔"

جلدی جلدی لفافہ چاک کر کے اس نے پڑھا۔

"ممتاز مر گئی۔ جلدی پہنچو۔"

وقتی طور پر وہ کچھ پریشان ہوگئی۔ لیکن جلد ہی اخبار اٹھائی اور پڑھنے لگ

توقیر آج خلافِ معمول دو بجے ہی واپس آگیا۔ برجیس نے اسے تار د

دے کر اندر آیا اور پڑھنے لگا۔ برجیس بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔

"ممتاز آپ کی کون ہیں؟"

توقیر کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ رومال سے اس نے اپنی آ
پونچھ کے کہا۔ "خالہ"

برجیس کے دل کے کسی تاریک کونے میں ہمدردی نے انگڑائی لی
لیکن۔

توقیر سے نفرت تو اپنی جگہ اٹل تھی۔ ہمدردی کا وہ جذبہ وہیں مٹ
گیا۔

ہکلاتی ہوئی آواز میں توقیر نے پھر کہا۔

"میں جا رہا ہوں۔ تم نے جانا ہو تو تیاری کر لو۔"

برجیس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹنے لگی۔
میں ملازمہ اندر آئی۔ برجیس نے پانچ روپے اسے دیے اور ساتھ ہی کا
لکھ بھی دیا۔

"بڑی بی! ہم ابھی جا رہے ہیں تار آگیا ہے۔ یہ لو پیسے اور ساتھ وا
ڈاکخانے سے کریمن بوا کو تار دے آؤ۔ وہ اسٹیشن پر ہمیں لینے آجائیں گ

ملازمہ کاغذ اور پیسے لے کر باہر چلی گئی۔

توقیر نے اپنا اٹیچی درست کیا۔ پھر اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ پینتیس روپے
اور کچھ پیسے تھے۔ ریل کا تھرڈ کلاس کا کرایہ اور راستے کا خرچ تو ہے ہی اس نے
سوچا اور سنبھال کر کوٹ کے چور خانے میں رکھ لیے۔

برجیس نے ملازم کو ٹیکسی لانے کے لیے کہہ دیا۔ توقیر اپنا اٹیچی اٹھا کر باہر نکلنے
لگا تو برجیس بولی۔

"اپنا دوسرا اٹیچی بھی لے لیں۔"

توقیر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اس میں شادی کے سوٹ ہیں۔ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا اپنا سامان
میرے پاس ہے۔"

ٹیکسی سے دونوں اسٹیشن پہنچے۔ برجیس سامان قلیوں نے اٹھا لیا۔ توقیر اپنا
اٹیچی خود اٹھائے ٹیکسی سے نکلا اور ذرا مدھم آواز میں دیکھے بغیر کہا۔

"اپنا ٹکٹ جلدی جلدی خرید لو۔ گاڑی چھوٹنے والی ہے۔"

اس نے اپنا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید لیا۔ برجیس بھی اتنی دیر تک ٹکٹ لے
چکی تھی تو قلیوں نے اس کا سامان رکھ کر اسے فسٹ کلاس کے ڈبے میں بٹھا بھی دیا
تھا۔ توقیر اُسی کے ڈبے کے پاس سے گزرتا ہوا رکا۔ اور رسماً دروازے میں اندر جھانکا
برجیس سیٹ پر بیٹھی تھی کچھ اور عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ توقیر کو دیکھتے ہی برجیس نے
ظاہرداری قائم رکھنے کے لیے شائستہ لہجے میں کہا۔

"آپ بیٹھ جائیے۔ اب اپنے ڈبے میں، گاڑی چلنے والی ہے۔"

توقیر آکر تھرڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔ گاڑی تھوڑی دیر بعد چل دی۔

دوسرے دن دونوں اپنے شہر پہنچے۔ کریمن بُوا اسٹیشن پہ لینے آئی ہوئی تھی۔ توقیر
جب پلیٹ فارم سے باہر نکلنے لگا تو برجیس اور کریمن بُوا بھی اس وقت باہر آ رہی تھیں
قلی برجیس کا سامان اُٹھائے آگے آگے چل رہے تھے۔ توقیر کو دیکھتے ہی کریمن بُوا
نے سلام کیا۔ باہر نکل کر وہ دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ توقیر ان کے پاس ہی کھڑا تھا
کریمن بُوا نے اسے آواز دی۔

"صاحب! آپ نہیں چلیں گے؟"

اتنی دیر میں ایک رکشا آگئی۔ توقیر نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے رکواتے ہوئے

"نہیں بُوا ابھی نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔ پہلے اپنے گھر جاؤں گا
کچھ دنوں بعد آؤں گا۔"

رکشہ سے وہ گھر پہنچا اور اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوا وہ منزہ اور شہنازہ
ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ توقیر کو دیکھتے ہی اُٹھی اور آگے بڑھ کر لپٹا لیا۔

"میرا لال۔" توقیر کے گال اور پیشانی کے اس نے پے در پے بوسے لئے

"ممتاز تو بیٹا! پرسوں فوت ہوگئی تھی۔ کل ہم نے دفن کر دیا۔ تم دور تھے۔ اس
انتظار نہیں کیا۔" توقیر بڑی بے بسی سے منزہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اچانک وہ اُٹھ
بھیا کہتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔ توقیر اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دینے

"دیکھو نزی! جان ہار نہ بننا۔ یہ نہ سمجھنا تم اکیلی رہ گئی ہو۔ تم امی جان کو اپنی ماں او
اپنا بھائی سمجھو۔" اس نے منزہ کو پھر کرسی پر بٹھا دیا اور تسلی دینے لگا۔ اسی وقت توقیر ک

فریدہ کمرے میں آئی۔ اس کے ساتھ اس کا بھائی زاہد بھی تھا۔ فریدہ نے منزہ کے سر
پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے ہوتے ہوئے تم کیوں روتی ہو۔ چلو اُٹھو آؤ میرے ساتھ منزہ کا بازو پکڑ کر
اس نے اسے اُٹھایا اور دونوں بہن بھائی اسے لے کر آگے نکل گئے فریدہ یا زاہد میں
سے کسی نے بھی توقیر سے اس کی شادی یا آنے کے متعلق کوئی گفتگو نہ کی وہ جب باہر
نکل گئے تو ساجدہ نے پوچھا۔

"برجیس نہیں آئی بیٹا!"

توقیر کو سچ سے گریز ہی کرنا پڑا۔

"نہیں وہ نہیں آئی۔"

شہناز بیتابی سے بولی۔

"ساتھ لے آتے ہوتے بھابی کو بھی بھیا۔ ہم نے تو ابھی تک اسے دیکھا ہی نہیں ہے۔"

"کچھ دنوں بعد جاؤں گا پھر لے آؤں گا۔"

بات آگے بڑھ رہی تھی اس لیے اس نے رُخ بدلا۔

"امی! بھابی آج کل بڑی نرم دل ہو رہی ہیں۔ منزہ کا بڑا خیال رکھا جا رہا ہے۔

"چلو شکر ہے بیٹا۔ ہمیں بیشک نہ پوچھے۔ اس یتیم بچی کا تو خیال رکھے نا یہی اس کی
مہربانی ہے۔"

توقیر اُٹھ کھڑا ہے۔

"امی! میں کپڑے بدلوں۔ پھر باتیں ہوں گی۔"

"بدل لو بیٹا۔"

اٹیچی اٹھائے وہ اپنے کمرے میں آگیا۔

کوئی ایک ماہ گزر گیا۔ یہاں بھی ملازمت کے لیے انتھک کوشش کی۔ لیکن کامیا
کی کرن کہیں بھی نہ دکھائی دی۔ اس عرصے میں وہ کچھ تصویریں بنا کر شاکر کی دوکان
رکھ آیا تھا۔ ساجدہ کو اس نے برجیس کے ساتھ بے تعلقی سے بھی آگاہ کر دیا
وقتی طور پر اسے سخت صدمہ ہوا۔ لیکن آہستہ آہستہ سنبھل ہی گئی۔ کنول اور جمیلہ
ملنے وہ ابھی تک نہ گیا تھا۔ نہ ہی ان کے پاس کوئی سامان پھینکا پھینکا تھا۔ جی
بہت چاہتا تھا۔ لیکن جیب ہی خالی تھی۔

آج وہ پھر شاکر کی دوکان میں ایک تصویر چھوڑ کر واپس آ رہا تھا کہ پیچھے۔
کسی نے اسے پکارا۔

"توقیر!" کسی لڑکی کی آواز تھی۔

اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ کنول ایک میڈیکل سٹور سے نکل رہی تھی۔ وہ کھڑا
کنول مسکراتی ہوئی قریب آئی۔

"آپ تو ملنے سے بھی رہے۔"

توقیر مسکرا دیا۔

"کیا ہو گیا؟"

"کچھ نہیں ہوا دو مہینے ہو گئے۔ آپ نے تو اپنا چہرہ تک نہیں دکھایا۔ امی روز
پوچھتی ہیں توقیر تو نہیں ملا۔ مجھے آپ کی طرف سے روز جھوٹ بولنا پڑتا ہے کہ کو

ہوگا جس کی وجہ سے نہیں آئے۔"

"نوازش ہے آپ کی۔"

"آپ کا رزلٹ کیا ہوا۔"

"عرصہ ہوا پاس ہو گیا۔"

"مبارک"

"شکریہ۔"

"آج کل کیا کر رہے ہیں؟"

"دھکے کھا رہا ہوں۔"

"ہوں؟"

"اور کیا کروں۔"

"سروس کریں۔"

"کہاں ملتی ہے۔ کراچی تک گیا تھا وہاں بھی نہیں ملی۔"

"کب گئے کراچی؟"

"کوئی ڈیڑھ ماہ ہو گیا ہے۔ اسی لیے تو تمہارے ہاں آ نہ سکا تھا۔ تمہارے امتحان کا کیا
ہوا۔ آخری سال میں آگئی ہو۔"

"خدا تمہیں کامیاب کرے تم ڈاکٹر ہو جاؤ، تو پھر ہم کبھی بیمار ہوئے تو تم سے علاج کرایا
کریں گے۔"

کنول ہنس دی۔

"خدا آپ کو بیمار کرے ہی نہ۔"

"بازار کیا کرنے آئی ہو؟"

"امی جان کے لیے دوائیاں لی ہیں۔"

"ابھی گھر جاؤ گی؟"

"جی۔"

"چھوڑ آؤں یا چلی جاؤ گی؟"

"چھوڑ آئیں تو آپ کی مہربانی ہے۔ امی جان کو بھی مل لیں گے۔"

"لیکن ٹیکسی کا کرایہ آپ کو دینا ہوگا۔ میرے پاس آج کچھ بھی نہیں۔" تو
کوٹ کی دونوں جیبیں الٹی کر کے دکھا دیں۔

"آپ چلیں تو سہی کرائے کا فکر نہ کریں۔ ابھی تو آپ نے پاس ہونے کی
بھی نہیں کھلائی اور جیبیں پہلے ہی خالی دکھانے لگے ہیں۔ نہ ہی آپ نے
بنوا کے دی ہے جس کا وعدہ کیا تھا۔"

"بھئی ابھی نہیں چلوں گا تمہارے ساتھ میں۔"

"یہ کیا تُک ہوئی۔"

"آج بدھ ہے نا اتوار کو آؤں گا۔ تمہاری تصویر بھی لیتا آؤں گا اور مٹھائی بھی"

"ابھی تو آپ چلئے نا۔ اتوار کو بھی آجائیے۔"

"نہیں نہیں اتوار کو ہی آؤں گا۔ اچھا میں چلا۔" وہ تیزی سے آگے بڑھنے

"آہستہ چلئے نا، میں نے بھی ادھر ہی جانا ہے۔ بھاگ کیوں رہے ہیں۔ اا

اگر آپ نے آنا ہے تو پھر شام کا کھانا بھی وہیں کھانا ہوگا۔"

"ڈنر دے رہی ہو کیا؟"

"ہم غریب ڈنر کیا دیں گے۔ سادہ سا کھانا آپ کے پاس ہونے کی خوشی میں
دیں گے۔"

"ضروری ہے کیا؟"

"بے حد ضروری۔"

لارنس روڈ کا چوک آ گیا تھا۔ توقیر بڑی تیزی سے بولا۔

"جلدی چلو کنول تمہاری بس آ رہی ہے۔"

تیز تیز چلتے دونوں چوک پر پہنچ گئے بس بھی آ کر رک گئی۔ توقیر نے کنول کو بس
میں بٹھایا اور خود پیدل ہی گھر کی طرف چل دیا۔

کنول جب گھر پہنچی جمیلہ پلنگ پر بے حس پڑی تھی۔ پروین بھی اس کے پاس
بیٹھی تھی۔ کنول نے دوائیاں جب میز پر رکھیں تو آنکھیں جھپک کر اس نے دیکھا۔

"آ گئی۔ بیٹی۔"

"ہاں امی! دوائیاں لے آئی ہوں۔ توقیر بھی ملا تھا امی!"

جمیلہ کی آنکھیں چمک گئیں۔

"پھر۔ تم ساتھ نہیں لائی؟"

"میں نے بہت کہا امی! پہلے آنے بھی لگے تھے۔ لیکن میں نے کہا آپ نے ابھی
ہمیں پاس ہونے کی مٹھائی نہیں کھلائی تو کہنے لگے پھر میں اتوار کو مٹھائی لے کے حاضر

ہوں گے۔ آج کل سروس کے لیے بہت دھکے کھا رہے ہیں۔ کہہ رہے تھے۔ میں
تمہیں ٹیکسی میں سے چھوڑ آتا۔ لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ بہت صاف گو ہے
جمیلہ رو دی۔ کئی موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اس کے چہرے پر سے
ڈھلک گئے۔ کنول کا دل بھی بھر آیا۔

"تم نے اسے کچھ روپے دے دیئے ہوتے بیٹی! وہ جب میرے پاس ہوتا ہے
تو میں یوں محسوس کرتی ہوں گویا میرا تنویر جوان ہو کر میرے پاس بیٹھا ہے۔ کاش یہ
میرا تنویر ہوتا۔ میں جب اسے دیکھتی ہوں تو میرا خون گردش کرتا ہوا بار بار پکارتا
ہے۔ یہی تمہارا بیٹا ہے۔ لیکن دل کو بہلا دیتی ہوں کو یہ بیچارا تو نہ جانے کس دکھیاری
ماں کا سہارا ہوگا۔ جس دن یہ مجھے لانوں سے اُٹھا کر لایا تھا۔ اس رات میں بہت روئی
تھی۔ خدا کے حضور بار بار دعا کرتی تھی۔ الٰہی تو مجھے بھی میرا بیٹا ملا دے۔ لیکن اس
مالک حقیقی کو نہ جانے کیا منظور ہے، جو مجھ بدبختی کو میرا بیٹا جوانہیں مل پا رہا۔"

کنول نے جمیلہ کے آنسو پونچھ ڈالے۔

"کیوں روتی ہو امی۔"

پروین بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور جمیلہ کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کب تک یہ حالت بنائے رکھو گی امی اب تنویر بیچارہ تو پتہ نہیں کہاں ہوگا
رونے سے کیا حاصل۔"

جمیلہ کے چہرے پر پھر آنسو ڈھلک آئے۔

کنول بے چین ہو گئی۔

"پھر رونے لگیں امی۔"

جمیلہ پھٹ پڑی۔

"روؤں کیوں نہ میرا دل پلپلا جا رہا ہے!
آگ لگ گئی ہے میرے خون میں۔
پگھل گئی ہوں میں غم کی بھٹی میں۔
اس بے رحم زمانے نے مجھے گیلی لکڑی کی طرح سلگا دیا ہے۔
تم نے مجھے یہ کیوں بتایا اس کے پاس آج پیسے نہیں تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا
ہے۔ جیسے میرا تنویر بھوکا پیاسا سڑکوں پر دھکے کھا رہا ہو۔

پروین سسک سسک کر رونے لگی۔

کنول کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا سوتا پھوٹ نکلا۔

جمیلہ ہاتھ اٹھا کے پھر کہنے لگی۔

اے دونوں جہاں کے پالنے والے میرے مقدر میں اگر جیتے جی بیٹے کی شکل دیکھنا
نہیں لکھا تو مجھے موت دے دے۔ اٹھا لے اس دنیا سے مجھے ایسی زندگی نہیں
چاہیئے۔ نہیں چاہیئے وہ روتے ہوئے چیخ پڑی۔

پروین بھی روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

دونوں ماں بیٹی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ کنول کی حالت قابل دید تھی۔ اُس
کا بدن لرز رہا تھا۔ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ قریب تھا کہ وہ گر جاتی۔
لیکن سنبھلی اور کرسی پر بیٹھ کر چھم چھم رونے لگی۔

تینوں کچھ دیر روتی رہیں۔

آخر کنول سنبھلی پہلے اپنے آنسو خشک کئے۔ پھر پروین کو چپ کرایا اور ا
دے کر کرسی پر لا بٹھایا۔ جمیلہ کی آنکھیں بھی اس نے پونچھیں اور اسے اٹھا کر تکیوں
سہارے بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اُٹھیے امّی! دوائی پی لیں۔"

جمیلہ نے گھگیائی آواز میں دکھ سے کہا۔

"کیا ضرورت ہے ان دوائیوں کی بیٹی! دل پر زنگ کی طرح چڑھا ہوا غ
سے اُترا ہے۔ دکھوں کی طویل راتیں زنگ کی طرح میرے جسم کو کھا گئی ہیں۔ یہ
جائیں گی اب۔"

کنول نے اپنے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"پھر ویسی ہی باتیں امّی!"

جمیلہ نے اپنے رانوں پر ہاتھ مارے۔

"کیا کروں بیٹی! ایسی باتوں کے سوا اب میرے پاس کچھ نہیں رہ گیا۔"

بس اَب چُپ ہو جائیے۔

پروین ابھی تک سسک رہی تھی۔ کنول نے اس کا دھیان بٹانے کو کہ

"باجی! اس سُرخ اور سفید دوائی کا ایک ایک گھونٹ گلاس میں ڈال دیجئے
کو دوائی پلادوں۔"

پروین نے دوائی بنا کر دی۔ کنول نے ایک ہاتھ سے جمیلہ کا سر تھامے رکھا

سے اسے دوا پلا کر پھر اسی طرح لٹا دیا۔

جمیلہ اب کچھ سنبھل گئی۔

کنول نے دوائی کی شیشیاں میز پر ترتیب سے لگاتے ہوئے پھر کہا۔

"امّی ایک بات کہنا تو میں بھول ہی گئی۔"

جمیلہ نے تھکی تھکی نگاہوں سے دیکھا۔

"کہو۔"

"آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔"

"پہلے بھی کبھی ہوئی ہوں۔"

"میں تو قیصر کو اتوار شام کا کھانا یہاں کھانے کے لیے کہہ آئی ہوں۔"

بس۔ یہ تو میں خود بھی سوچ رہی تھی کہ اُسے کسی دن کھانے پر بلایا جائے۔ میں اس سے
بہت کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"کیا پوچھیں گی آپ؟"

یہی کہ اس کے ابا کیا کرتے ہیں۔ ماں ہے یا مر گئی ہے۔ بہنیں کتنی ہیں۔ بھائی کتنے ہیں۔
بس یہی اور اس بیچارے سے کیا پوچھوں گی میں ہاں ایک بات اور میں نے سوچی ہے۔"

"کیا امّی!"

"اسے کوئی چیز بھی دینی چاہیئے پاس جو ہوا ہے۔"

"کیا دیں؟"

"سوٹ نہ بنا دیں۔"

"اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے امّی! ڈیڑھ دو سو کا کپڑا آئے گا اور ڈیڑھ سو ہی سلائی کا خرچہ آ جائے گا۔"

"اتنی تو کپڑے کی قیمت نہیں ہوتی جتنی آج کل درزی سلائی لے لیتے ہیں۔"

"پھر تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"پتلون قمیض کا کوئی اچھا سا کپڑا دے دیں گے۔"

"سلا کر نہیں دو گی؟"

"ہمارے پاس ان کا ناپ ہی کہاں ہے؟"

"پھر سلائی دے دیں گے ساتھ۔"

"ماں یہ ٹھیک ہے۔" وہ اس دن والا سو روپیہ ہے۔ "اس میں کچھ پیسے بچ جائیں کچھ اور ڈال کریں ان کو ایک جرسی بھی بنا دوں گی۔"

"چلو جیسے تمہاری مرضی۔ کل یا پرسوں بازار چلی جاتا اور اپنی پسند کا اس کے لیے کپڑا لے آنا اور ساتھ اچھی سی اون بھی لے آنا۔"

"ضرور لے آؤں گی۔"

"تینوں کچھ دیر خاموش رہیں۔"

"دودھ ہے کنول؟" جمیلہ نے پوچھا۔

"ہے امّی! چائے بنا دو بیٹی۔"

"ابھی لائی۔" کنول اٹھ کر باہر نکل گئی۔

کنول کو لارنس روڈ کے چوک پر بس میں بٹھانے کے بعد توقیر گھر لوٹ رہا تھا کہ راستے میں مخالف سمت سے آتا ہوا اس کا پرانا کلاس فیلو مسعود مل گیا۔ توقیر کو دیکھتے ہی وہ شکایت آمیز لہجے میں بولا۔

کہاں گھوم رہے ہو، نواب صاحب۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کے مر گیا ہوں تمہیں۔

توقیر نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"تمہارے ہاں گیا تھا۔ تمہاری امّی نے بتایا کہ باہر گیا ہوا ہے۔ کافی دن پہلے بھی آیا تھا۔ اس وقت بھی حضور گھر پر نہیں تھے۔"

"ہاں کراچی گیا ہوا تھا۔"

"کیوں ؟"

"ملازمت کے لیے"۔

"ملی کہیں ؟"

"نہیں"

"چہ چہ چہ آج کل کے بچارے گریجویٹ"۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔ توقیر نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا"۔

"نہیں چلو چوک پہ چلتے ہیں۔ ہوٹل میں بیٹھ کے باتیں بھی ہوں گی اور چائے کا ایک کپ بھی پیا جائے گا۔"

"چلو۔ توقیر واپس مڑ گیا"۔

"پھر کیا کر رہے ہو آج کل"۔

"کچھ بھی نہیں۔ تین چار تصویریں بنا کر دوکاندار کو دی تھیں وہ بھی ابھی تک ن یہاں بھی سروس کے لیے بہت کوشش کی ہے لیکن نہیں ملی۔ تم جم گئے ہو کہیں

"کہاں میاں۔ سروس تو میری تمہاری قسمت میں ہی نہیں۔ میں نے شہر کی ایک مل۔ فرم۔ دوکانیں حتیٰ کہ دفتر روزگار تک چھان مارا مگر کہیں ملازمت نہ

"پھر میری طرح آوارہ گردی ہی کرتے ہو۔"

"نہیں۔ انسان کو کچھ کر کے دکھانا چاہیئے میاں۔ یہ تو نہیں پڑھ لکھ کر کہیں کہ دفتری کام کے علاوہ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے تعلیم جو ہے یہ نانک مزاجی انکاری کا سبق نہیں دیتی۔ پڑھے لکھوں کو تو اوروں کی نسبت مستقل مزاج باہ

لم ہونا چاہیئے تاکہ ناسازگار حالات میں بھی ان کے قدم ڈگمگانے نہ پائیں"۔

توقیر نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں بھی تمہارے ان خیالات کا قائل ہوں۔ تعلیم یافتہ انسان کو کوئی بھی کام کرتے وئے عار محسوس نہیں کرنی چاہیئے۔ سوسائٹی میں مل جل کر اسے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ کام بھی رنا چاہیئے تاکہ غیر تعلیم یافتہ طبقہ ان سے نصیحت حاصل کرے۔ معاشرے میں سلجھاہٹ یدا ہو اور قوم ترقی کرے۔"

مسعود نے خوش ہو کے کہا۔

"یہ بات کی ہے میرے مزاج کے عین مطابق میں نے بھی جب دیکھا کہ کوئی دفتری ام نہیں ملتا تو ایسا کام کرنے لگا ہوں جو پڑھے لکھے عام طور پر نہیں کرتے"۔

"کیا کرتے ہو"؟ جستجو سے توقیر نے پوچھا۔

"سنو! میرے ایک حقیقی ماموں ہیں۔ نام ان کا ہے غیاث۔ وہ شروع سے ہی مچھلیاں پکڑ کر بازار بیچنے کا پیشہ کرتے ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ مچھلیاں پکڑ کر اب بازار بیچتا ہوں۔ اس طرح کم از کم سات یا آٹھ روپے روزانہ کما لیتا ہوں۔ پہلے کچھ دن تکلیف ہوئی۔ لیکن اب تو محسوس تک ہی نہیں ہوتا۔ ماموں نے ایک گدھا گاڑی رکھی ہوئی ہے۔ اس میں بیٹھ کر دونوں پچھلے پہر مچھلیاں پکڑ لیے چلے جاتے ہیں۔ اور صبح ہر روز بیچ یتے ہیں۔ کبھی دوکاندار ہی اکٹھی لے لیتے ہیں۔ کبھی پکانے والے لوگ منڈی سے آکر لے جاتے ہیں۔ ہم دونوں ماموں بھانجا صبح ہی صبح فش مارکیٹ میں مچھلیاں لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس بکنے میں دیر ہی نہیں لگتی"۔

مسعود نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر دو سگریٹ سلگائے۔ ایک توقیر کو دیا اور
کا خود کش لگاتے ہوئے کہا۔

"اب تم ہی بتاؤ یہ کوئی بُرا کام تھوڑا ہی ہے۔ میرے خیال میں تو اس کے
ہیں۔ پہلا تو یہ ہے ملازمت کی فکر سے نجات مل گئی اور ایک بڑا سا خاندان جو
سہارا ہوں کچھ کچھ خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ ملک
بھی ہے کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے پیداوار میں اضافہ ہے نا۔ کیا خیال ہے تمہا

توقیر نے ایک عزم سے کہا۔

"بہت اچھا کرتے ہو تم۔ کل سے میں بھی تمہارے ساتھ جایا کروں گا۔ ملا
کے یہ دھکے کھانا تو بیکار ہے۔ سب سے اچھا کام ہے یہ۔"

مسعود نے حیرت سے پوچھا۔

"تم بھی چلا کرو گے؟ پھر تو مزا آ جائے گا۔ سوسائٹی کا۔ تم کل سے اسی
کرو۔ ہم یہیں سے گزرتے ہیں۔ روزانہ تمہیں گدھا گاڑی میں بٹھا کر ساتھ
گے مچھلیاں تمہاری بھی ہمارے پاس رہا کریں گی۔ صبح ہم مارکیٹ لے لیا کریں
بیچ لیا کرنا۔ میں ماموں سے آج ہی تمہارا ذکر کروں گا۔ اور ہاں تمہارے پیسے
بندوبست بھی کر لیں گا۔ تم کوئی فکر نہ کرنا۔ میرا ماموں تمہیں دیکھ کر بہت خ
اچھا آدمی ہے۔ مجھے تو پڑھایا بھی اسی نے ہے اور اب میں اکیلا سات
خاندان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں۔ دو چھوٹے بھائی دو چھوٹی بہنیں ایک
بڑی بیوہ بہن اور ایک بھانجا۔"

توقیر نے افسوس سے پوچھا۔

"کب فوت ہوئے تمہارے بہنوئی؟"

"ہے تو زندہ ہی۔ لیکن پھر بھی بیوہ ہی سمجھو میری بہن کو۔"

"وہ کیسے؟"

اس طرح کہ آج سے کوئی سات برس قبل میری بہن کی شادی ہوئی۔ میرا بہنوئی میٹرک تھا۔ دو سال بڑے خوش و خرم زندگی گزارتے رہے تھے۔ اس کے بعد وہ صاحب یورپ چلے گئے۔ چھ ماہ تک تو پیسے بھجوانے کے علاوہ باقاعدگی سے خط بھی لکھتے رہے۔ اس کے بعد اچانک خاموش ہو گئے۔ تین سال تک اُن کا کچھ اَتہ پتہ نہ چلا۔ میری بہن نے یہ عرصہ رو رو کے گزارا۔ پھر ایک صاحب جو اس کے ساتھ ہی کام کرتے تھے۔ واپس اپنے وطن آئے تو ان سے پتہ چلا کہ میرے بہنوئی نے وہاں شادی کر لی ہے۔ ان کے بچے بھی ہیں اور انہوں نے وہاں مستقل رہائش اختیار کر لی ہے اب میری بہن اس بات کو تسلیم نہیں کرتی اور برابر اس کا انتظار کئے جا رہی ہے۔ لیکن اسے احساس ہی نہیں کہ ایک مشرقی عورت اس کی خاطر کیا کیا دُکھ جھیل رہی ہے یہ تو ہے آج کل ہمارے نئے طبقے کے پڑھے لکھوں کی حالت۔

توقیر نے دُکھ سے کہا بہت بُرا کرتے ہیں کچھ لوگ۔ یہ نئی پود تو مغربیت کو اس قدر تیزی سے اپناتی ہے گویا ان کا پیدائشی حق ہو اور حقیقت سے دیکھا جائے تو مغربی تہذیب میں فائدے کم ہیں اور خامیاں زیادہ اور پھر ہمارے لوگ اسے اپناتے بھی غلط انداز سے ہیں۔ یعنی ان کے ہر قول، فعل اور عمل میں جنسی جذبات نمایاں ہوتے ہیں اور یہ ایسے گندے جراثیم ہیں جو معاشرے کو تباہی کی طرف بہائے جا رہے ہیں۔ ہماری مشرقی بہنوں اور مغرب زدہ

لڑکیوں میں تو دن بدن فاصلے بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

مشرقی بہنیں۔

شرم وحیا اور وفا کا ایک مینار۔

شوہر کے لیے سکون کا ایک تاج محل۔

دکھ سکھ اور غم کی سردی میں شوہر کے لیے جلتا ہوا ایک گرم لاوا۔

اور جب قربانی کا وقت آئے تو اپنے آپ کو مٹا کر بھی خاندان کی آن پر داغ
آنے دیتی۔

لیکن مغرب زدہ

اُف

ان کا ایک ہی مقولہ ہے تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی یا اس کے علا
سرِعام اپنے بدن، حسن وجوانی اور رنگ وروپ کی نمائش اور یہی ان کے
سرمایہ حیات ہے۔ دوسری طرف ہمارے مغرب زدہ بھائی بھی مقررہ حدو
بہت ہی آگے بڑھ چکے ہیں۔ عورت تو ان کی نگاہوں میں بالکل ایسی ہے
بھیڑ بکری۔ جب تلک جی چاہا اپنے ساتھ ہانکتے رہے جب جی بھر گیا طلاق
...... فارغ کر دی گویا بکری تھی جسے ڈنڈا مار کر نکال دیا۔ حالانکہ
ایک اہم رکن ہے اور گھر کی چلتی ہوئی گاڑی کا ایک مضبوط پہیہ وہ اپنی عقل
محبت اور چاہت سے اور کچھ اپنی اداؤں کا خدا بنا کر جہنم سے گھر کو بھی
دیتی ہے لیکن جب اس کے جذبات کو کچلا جائے اس کے عورت پن کو

پہنچائی جائے۔ اس کی چاہت کا جواب نہ دیا جائے تو وہ اپنی ساری خوبیوں کا
لبادہ اُتار کر ایک پھنکارتی ہوئی ناگن بھی بن جاتی ہے۔ کاش ہمارے مغربی تہذیب
کے اندھے مقلّد بھائی واپس اپنی تہذیب کو لوٹ آئیں اور مغرب زدہ بہنیں بھی اس
تہذیب سے اتنا کچھ ہی لیں جتنا ان کے لیے فائدہ مند ہے تو ملک میں آئے دن رونما
ہونے والے گھناؤنے حادثات کی روک تھام ہو جائے اور تفریح کے نام پر چلنے والے
نائٹ کلب اور ایسے ہی عیّاشی کے دوسرے اڈّے ناپید ہو جائیں۔

مسعود نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے کہا

اس صدی میں تو ناممکن ہے۔ آگے کا خدا حافظ ہے۔

چوک آ گیا تھا۔ دونوں پہلو سے پہلو ملائے ہوٹل میں گھس گئے۔

دوسرے دن سے توقیر بھی غیاث کا سلوک اس سے بالکل ایسا ہی تھا جیسا ایک
شفیق باپ کا بیٹے سے ہو۔ بیکار بیٹھے رہنے کے بجائے وہ بھی مسعود کی طرح چھ سات
بلکہ کبھی کبھی آٹھ نو روپے روزانہ کمانے لگا تھا اور یوں روزگار کی طرف سے ایک طرح
کی یکسوئی سی ہو گئی تھی۔

ہفتے کے روز شاکر سے بھی اسے ساٹھ روپے مل گئے تھے۔ تیس تیس روپے میں
کوئی دو تصویریں لے گیا تھا۔ اس کے کوٹ کی خالی جیبیں پھر سکون سے چھنچھنانے لگی تھی۔

اتوار کو وہ مچھلیاں پکڑنے کے بعد شام کے ذرا بعد جمیلہ کے ہاں گیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔
اس نے دروازے پر دستک دی۔ کنول نے دروازہ کھولا۔

"کون ہے؟"

اس نے بڑی مسکنیت سے کہا۔

"جی میں توقیر ہوں۔"

"کیا اجنبیوں کی طرح باہر کھڑے ہو گئے۔ دروازے کو زنجیر تو لگی ہی نہیں تھی
آپ باہر کیوں کھڑے ہو گئے۔ آجائیے اندر۔"

"دو گتے کے پیکٹ ایک فریم اور ایک بنڈل اُٹھائے وہ اندر آیا۔ جمیلہ کو سلام کر کے
ہاتھ میں پکڑی ہوئی ساری چیزیں ایک کرسی پر رکھ دیں اور دوسری کرسی پر خود بیٹھ گیا۔ کنول
جمیلہ کے پلنگ پر ہو بیٹھی وہ شاید پہلے بھی وہیں بیٹھی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے سامنے
نائیٹنگ پھیلا رکھی تھی۔

جمیلہ کچھ کہنے والی تھی کہ کنول بول پڑی۔

"دیر سے کیوں آئے آپ؟"

"بس دیر ہو گئی۔ آج کام میں کچھ زیادہ مصروف ہوں۔"

"میں نے کھانا کب سے تیار کر کے رکھا ہے۔ اب ٹھنڈا کھانا پڑے گا مجھ
سے بار بار گرم نہیں ہوتا۔" کنول نے بڑے پیار سے کہا۔

"کس نے کہا تمہیں گرم کرنے کو مجھے تو زندگی میں کبھی گرم کھانا ملا ہی نہیں۔ آج بھی
ٹھنڈا کھاؤں گا تو کوئی پہاڑ نہیں ٹوٹے گا۔"

جمیلہ کے دل پر چوٹ سی لگی۔ اس کا دل رونے کو امنڈ آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ
کو بہلانا چاہا۔ "جاؤ بھائی کھانا گرم کر لاؤ۔"

کنول مسکرا دی۔

"میں تو مذاق کر رہی تھی امی! کھانا گرم رکھا پڑا ہے۔ آپ پہلے ان سے پوچھئے یہ لائے
کیا ہیں؟"

توقیر نے سامان اٹھا کر میز پر رکھ دیا۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے میں خود ہی بتاتا ہوں۔ یہ رہی مٹھائی۔"

وہ بنڈل میں کیا ہے۔ کنول نے پوچھا

"اس میں دو شالے ہیں دو۔ ایک ماں جی کے لیے اور ایک تمہارا!"

جمیلہ نے سختی سے احتجاج کیا۔

"یہ تم کیوں خرید لائے ہو بیٹا!"

توقیر مسکرا پڑا۔

"بہت دنوں سے آپ کو کچھ دینے کے لیے میرا جی چاہ رہا۔ لیکن ——— لیکن
——— دراصل"

"میرے وسائل بہت محدود ہیں۔ جن کی بنا پر میں اپنی یہ خواہش جلدی پوری نہ کر سکا۔"

جمیلہ کے دل پر یہ دوسری چوٹ لگی۔

توقیر نے پیکٹ کھولا اور ایک دوشالہ جمیلہ کی طرف بڑھا کے کہا۔

"آپ ایک دفعہ یہ مجھے اوڑھ کے دکھا دیں۔ بس یہی میری آرزو ہے۔"

دوسرا دوشالہ اس نے کنول کی گود میں رکھ دیا۔

جمیلہ میں اتنی ہمت نہ جانے کہاں سے آگئی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں اور بازوؤں
کے سہارے وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ کنول نے آگے بڑھ کر اس کی پشت پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

جمیلہ نے دوشالہ اوڑھا اور مسکرا کے توقیر کی طرف دیکھا۔

"بس بیٹا!"

"ہاں ماں بس مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے جیسے میں نے جنّت پالی ہو۔"

"ماں کے قدموں میں جنّت ہی تو ہوتی ہے۔ کیوں ماں جی؟"

جمیلہ کے بجھے ہوئے دل پر یہ تیسری چوٹ تھی۔

توقیر نے ایک اور بنڈل کھولا۔

"اور یہ آپ کے کپڑے ہیں ماں جی! اسمر کا گرم سوٹ لایا ہوں آپ کے لیے۔"

"یہ تم نے کیا کیا بیٹا۔ کیا ضرورت تھی۔ غریب گھرانے اتنا خرچ نہیں کرتے۔ تم نے تو ہم پر خاصا بوجھ ڈال دیا ہے ہمارا کون ہے اسے اتارنے والا۔"

توقیر نے چاہت سے کہا۔

"مجھے آپ اپنا ہی بیٹا سمجھیں۔ جب سے میں نے آپ کے کپڑے لیے ہیں۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے گویا میں نے زندگی میں پہلی بار کوئی نیک کام کیا ہو اور پھر آپ جیسی ماں کی خدمت تو کسی مقدّر والے ہی کو نصیب ہوتی ہے۔"

جمیلہ کے نازک دل پر یہ چوتھا چرکا لگا۔

"اب صرف ایک کام رہ گیا ہے میرے ذمے۔"

"کیا؟" جمیلہ نے رو دینے والی آواز میں پوچھا۔

کنول کے کپڑے رہ گئے ہیں ابھی

کنول نے فوراً دخل اندازی کی۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بہت کپڑے ہیں۔ آپ پہلے اپنے حالات تو ٹھیک کریں۔"

اپنی حالت تو اب اگلے [illegible] بسی کہوں [illegible]گی۔ میں کبھی کبھی جب اکیلا بیٹھ کر سوچتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے نہ کوئی میری ماں ہے نہ باپ نہ بہن نہ ہی بھائی۔ ایسے موقع پر میں اداس ہو جاتا ہوں۔ پھر بازار چلا جاتا ہوں یا یہاں آپ کے پاس آجاتا ہوں اور آپ کی باتوں میں کچھ ایسی سکون کی کرنیں پھوٹتی ہیں کہ میں ہر چیز بھول جاتا ہوں۔ کاش میرا آپ کے ساتھ کوئی رشتہ ہوتا۔ لیکن خدا نے مجھے ایسی چار دیواری میں پیدا کیا [illegible] میرے ساتھی بنے ہوئے ہیں۔

جمیلہ کے صبر کے بندھ ٹوٹ گئے اور وہ رو پڑی۔

توقیر نے ڈوبتی آواز سے پوچھا۔

"آپ رو رہی ہیں ماں جی! ساتھ ہی اس کی اپنی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کے دو قطرے گر پڑے۔"

جمیلہ نے سسک کے کہا۔

"تم بھی تو رو رہے ہو بیٹا!"

"پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔"

جمیلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ابو کیا کرتے ہیں توقیر!"

"میں چھوٹا سا تھا۔ جب کہ مر گئے ہوئے ہیں۔"

"امی ہیں؟"

"جی زندہ ہیں۔"

"بہن بھائی۔"

"ایک بہن اور ایک ہی بھائی ہے۔"

"چھوٹا ہے یا بڑا؟"

"جی بڑا۔"

"کچھ کرتا ہے۔"

"وکیل ہے۔"

"پھر تم اس طرح کیوں دھکے کھاتے پھرتے ہو۔ بھائی علیحدہ ہے کیا؟"

بس علیحدہ ہی سمجھیں۔ میرا بھائی اور بھابی میرے سخت مخالف ہیں۔ میں ان کا بھائی نہیں۔ دشمن یا گھریلو ملازم ہوں۔ بھابی اپنے بھائی کو ڈاکری رہی ہیں اور مجھے پوچھا ہی نہیں میری ماں بچاری نے تو مجھے محنت مزدوری کر کے پڑھ

جمیلہ اب بُری طرح رو دی۔

کنول نے نائٹنگ سمیٹ کر ایک طرف رکھ دی اور جمیلہ کے پیچھے بیٹھ کر لے اپنی گود میں لیتے ہوئے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر نیچی آواز میں کہا

"کیا ہو جاتا ہے امی! آپ کو؟"

جمیلہ نے آہ بھر کے کہا۔

"میرے دل کے ساتھ کسی نے منوں وزن باندھ دیا ہے۔ میری ہستی چکرا کر رہ گئی ہے۔ کس سے اپنی بے بسی کہوں۔ کسے اپنا دکھ سناؤں۔ بتاؤ نا۔ تم ہی بتاؤ۔"

"کسے کہوں زمانے نے مجھ پر کیا ستم کیا ہے۔"

کون ہے جسے دل کے داغ دکھاؤں۔

گزری یادوں کی چیخوں کے سامنے اپنے کان کیسے بند کروں۔

کسے کہوں میری زندگی چراغِ سحر کی طرح بجھتی جا رہی ہے۔

بتاؤ نا

تم چپ کیوں ہو۔

کنول رو رہی تھی۔

"تم بھی تو ایسے موقعوں پر رو دیتی ہو۔ کس سے میں اپنے سوالوں کا جواب پاؤں۔"

توقیر نے سر جھکا لیا۔

"ماں جی! میں جانتا ہوں۔ مجھے دیکھ کے آپ کو اپنا بیٹا یاد آ جاتا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں آپ کے دکھ نہیں بانٹ سکتا۔ کاش! میں آپ کا بیٹا ہوتا تو آپ کے سارے دکھ درد چھین کر دور پھینک دیتا۔ توقیر کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے اُمڈے اور میز پر گم گئے۔" اس نے کچھ اور کہنا چاہا۔ لیکن آواز نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ ہچکی سی لے کر خاموش ہو گیا۔

جمیلہ کچھ سنبھلی۔

"تقدیر کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے بٹیا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہے کوئی مرے ملہار گائے۔"

کنول نے موضوع بدل دیا۔

"کھانا لاؤں امی ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

جمیلہ نے جھٹ کہا۔

"ہاں ہاں جلدی کرو۔ اسی ٹیبل پر لگاؤ گی یا بڑا میز لاؤ گی۔ میرا تو خیال ہے یہ چھوڑ کر ایک طرف کر دو اور بڑا میز دوسرے کمرے سے اٹھا کر ادھر ہی لگا دو۔ تینوں یہیں بیٹھ جائیں گے۔"

کنول پلنگ سے اُتری۔ میز جب وہ اُٹھانے لگی تو کرسی پر فریم کی ہوئی ایک اُلٹی پڑی تھی۔

"یہ تصویر لائے ہیں میری؟"

"ہاں"۔ توقیر نے کہا۔

کنول اُٹھا کر دیکھنے لگی۔

"کس نے بنائی ہے یہ؟"

"نام نیچے لکھا ہوگا۔" دبے ہونٹوں سے مسکرا کر توقیر نے کہا۔

"ہوں تو آپ خود بتاتے ہیں۔"

"بس ایسے ہی ہے کچھ۔"

"مجھے بھی دکھانا بیٹی!" جمیلہ نے کہا۔

کنول نے تصویر اُسے تھما دی۔ جمیلہ مسکرا کر دیکھنے لگی۔

وہی منظر تھا جب توقیر اس دن جمیلہ کو لانوں سے اُٹھا کر لایا تھا اور کنول نے اسے ئے پلائی۔ تصویر میں جمیلہ پلنگ پر لیٹی تھی۔ پاس ہی سرجھکائے توقیر بیٹھا تھا اور کنول جمیلہ سامنے چائے کی پیالی رکھنے کے بعد توقیر کو کپ تھما رہی تھی۔ اس کی نگاہیں شرم و حیا بوجھل تھیں اور چنری کا آنچل اس نے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔

"بہت اچھی ہے۔" خوش ہو کر جمیلہ نے کہا۔

کنول نے شکایتاً کہا۔

"اب پتہ چلا آپ جھوٹ بھی کہتے ہیں۔"

"کیوں؟"

اس دن آپ ایک تصویر کہیں لے جا رہے تھے اور کہا تھا کسی نمائش پر ایک دوست بنوائی ہے۔ اتنی اچھی تصویر تھی وہ۔ میرے سامنے آپ نے اس لیے جھوٹ کہہ دیا نگ نہ کروں؟

"یہ بات نہیں اگر تمہیں وہ پسند ہے تو ویسی ہی ایک اور بنا دوں گا۔"

"لیکن وہ کس کو دی۔"

توقیر سنجیدہ ہو گیا۔

"سچ کہوں یا جھوٹ۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں۔"

توقیر کی درد میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

"کنول! حقیقت یہ ہے کہ میں تصویریں بنا کر بیچتا ہوں اور یہ میرے ذریعہ معا ش میں ایک ہے اب تو تمہیں میرے جھوٹ بولنے پر کوئی شکوہ نہیں ہونا چاہیئے"۔ تو سر جھکا لیا۔

کنول اداس ہو کے چپ ہو رہی۔

ایسی باتیں جمیلہ کا دل چھلنی کر رہی تھیں۔ اس نے چھٹکارا چاہا۔

"کنول لے آؤ نا دوسرا میز اور کھانا لگاؤ۔"

توقیر نے سامنے والا میز ایک طرف ہٹایا اور کنول کی طرف دیکھ کے کہا۔

"مجھے بتاؤ کنول! کہاں ہے میز میں اٹھا لاتا ہوں"۔

کنول دوسرے کمرے کی طرف چل دی۔

"آپ بیٹھے رہیں میں لے آتی ہوں"۔

"بھئی تکلّف نہ برتو چلو میرے ساتھ بتاؤ کہاں ہے"۔ توقیر اُٹھ کر کنول کے کمرے میں آیا۔ سامنے ایک لمبا سا میز پڑا تھا توقیر اسے اُٹھانے لگا تو کنول ہوئے مدہم سی آواز میں کہا۔

"آپ بہت شریر ہیں"۔

توقیر نے اُسے پیار سے گھورا۔

"وہ کیسے ؟"

"آپ نے ایسی تصویر کیوں بنائی۔ امّی کیا سوچتی ہوں گی"۔

ارے حد کرتی ہو تم بھی۔ انہوں نے کیا سوچنا ہے نہ ہی انہوں نے بُرا مانا ہے۔ وہ تو خوش ہو رہی تھی۔ تمہارا وہ شرما شرما کر چائے کی پیالی تھمانا اور پھر تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ کوئی اچھی سی تصویر ہو۔ مجھے یہی پوز پسند تھا۔ میں نے اسے رنگوں کا روپ دے دیا۔ تم اگر اپنی کوئی پسند بتا دیتیں، تو میں ویسی ہی بنا دیتا۔ میرا کیا ہے۔ میں نے برش ہی چلانا تھا۔ تمہیں پسند نہیں کیا یہ تصویر۔ اگر ایسی بات ہے تو دے دو میں واپس لے جاؤں گا۔ گزرے ہوئے حادثے کی ایک تصویری یاد تو رہے گی نا۔

کنول کسی بات میں اُلجھ گئی۔

"پسند کیوں نہیں۔ میری زندگی کی ویران اور سپاٹ راہوں میں یہی تو ایک موڑ ہے، جہاں کھڑے ہو کر میں ماضی اور حال کی تلخیاں فراموش کر کے مستقبل کی طرب آمیز سہانے رنگوں کی قوس و قزح میں کھو جاتی ہوں"۔

"اچھا جی تو آپ بھی اس حال کو پہنچ گئی ہیں ؟"

کنول کے چہرے پر شفق پھول گئی۔

"اچھا باتیں نہ بنایئے۔ ٹیبل باہر لے جایئے۔ میں جلدی جلدی کھانا لگاؤں"۔

توقیر نے میز اُٹھایا اور باہر لا رکھا۔ کنول اس پر کھانا رکھنے لگی۔ توقیر بیٹھ گیا۔ وہ ایک بار پھر بولی۔

"توقیر! کسی دن اپنی امّی کو میرے پاس لانا۔ میں اس سے کچھ پوچھوں گی"۔

"کیا پوچھیں گی آپ"۔

"بہت کچھ پوچھوں گی"۔

کنول نے میز پر کھانا چن لیا اور پھر تینوں بیٹھ کر خاموشی سے کھانے لگے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد توقیر نے باہر آکر ہاتھ دھوئے۔ کنول نے اتنی دیر برتن سمیٹے۔ توقیر پھر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ کنول برتن رکھ کے اندر آئی اور جمیلہ سے

"چائے لے آؤں امی!"

"ہاں ہاں لے آؤ۔" دانتوں میں خلال کرتے ہوئے جمیلہ نے کہا۔

کنول نے ایک ایک کپ توقیر اور جمیلہ کو دیا اور ایک خود لے کر ان کے پاس

کر پینے لگی۔

جمیلہ کو چائے پیتے ہوئے شاید کوئی اور بات سوجھی۔ اس لیے وہ توقیر سے

ہوئی۔

"توقیر!"

"جی!"

"میرا خیال ہے آج رات یہیں رہو۔"

توقیر نے جلدی جلدی چائے کا آخری گھونٹ ختم کیا۔

"آج نہیں پھر کبھی رہوں گا۔ اِن دنوں صبح سویرے ہی چند ایک اہم کام کرنا

کنول بھی بولی۔

"کام تو آپ کے ختم ہوں گے ہی نہیں اور نہ ہی رہنا ہے آپ نے۔ جب

کام۔ جب کوئی بات پوچھو مصروفیت کبھی آرام بھی کیا کریں۔ کیا کیا کرتے ہیں

ہمیں پوری تفصیل بتا کر جائیے۔"

توقیر ٹال گیا۔

"بھئی مجھ جیسے آدمی کو تو کھوٹے بیل کی طرح گھر میں کوس پچاس۔ ویسے وہ رہ کرتا ہوں کبھی ضرور آپ کے ہاں رات رہوں گا۔"

جمیلہ نے پھر کہا۔

"کب رہو گے بیٹا۔ مہینوں بعد تو تم آتے ہو اور گھڑی دو گھڑی بیٹھ کے بھاگ جاتے ہو!"

"اب کے جو آیا تو ضرور رات رہوں گا۔ اب مجھے اجازت دیجئے چلتا ہوں۔"

"تھوڑی دیر بیٹھو۔ کنول! اُٹھ کے کپڑے تو لے آؤ۔"

کنول اُٹھی اور اپنے کمرے سے جا کر ایک قمیض اور پتلون کا کپڑا اُٹھا لائی۔ اس کی مٹھی میں بھی کچھ تھا۔

جمیلہ نے کپڑے لے کر توقیر کی طرف بڑھا دیئے۔

"ایک غریب ماں کی طرف سے تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں۔"

توقیر کے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔

"یہ کیا؟ میں نہیں لوں گا۔ بدلہ اتار رہی ہیں آپ؟"

"نہیں بیٹا! ہمیں تو خبر ہی نہ تھی تم ہم پر اس قدر بوجھ ڈال دو گے۔ ہم دونوں ماں بیٹی نے تو پہلے ہی ارادہ کر رکھا تھا کہ تمہیں پاس ہونے کی خوشی میں کپڑوں کا ایک جوڑا دیں گے۔ ارادہ تو تھا تمہیں اچھا سا سوٹ سلا کر دیتی اور تم مجھے پہن کر دکھاتے لیکن غریب کی ہر تمنا تو مجبوریوں کا سایہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ہم ماں بیٹی اپنے وسائل میں یہی کچھ کر سکی ہیں اور یہ تمہیں قبول کرنا ہو گا۔ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔"

توقیر نے ہاتھ بڑھا کر کپڑے لے لیے۔

"زیادتی کی ہے آپ نے۔"

زیادتی نہیں۔ میری خوشی ہے"

"بیٹے تو ماؤں کو کچھ دیتے ہیں۔ اُن پر بوجھ نہیں ڈالتے۔"

جمیلہ مسکرا دی۔

"بڑے بوڑھوں کی سی باتیں نہ کرو۔"

توقیر کے جواب دینے سے پہلے ہی کنول بول پڑی۔

"چاہیئے تو یہ تھا کپڑے آپ کو سلا کر دیتے لیکن ہمارے پاس آپ کا ناپ نہیں تھا۔ اس لیے یہ لیجئے ان کی سلائی۔"

کنول نے بیس روپے اس کے سامنے رکھ دیے۔

توقیر جھنجلا سا گیا۔

"روپے تو میں قطعاً ہی نہ لوں گا۔ کپڑوں کا بوجھ ہی مجھ پر کافی ہے"

کنول نے جھٹ کہا۔

"آپ پر حلال ہم پر حرام۔ اب آپ انکار نہیں کر سکتے۔

توقیر نے احتجاج کیا۔

"یہ زیادتی ہے کنول!"

"کوئی زیادتی نہیں" کنول نے نوٹ اُٹھا کر اس کے کوٹ کی جیب میں ڈال دیئے۔

جمیلہ نے نئی بات کہی۔

"جرسی کا ناپ لے لو کنول! کہیں چھوٹی اور تنگ نہ رہ جائے۔"

کنول ہچکچائی۔

"شرماتی کیوں ہو۔ بازو اور چھاتی بالشتوں سے ناپ لے لو۔ لمبائی اندازہ لگا کے رکھ لینا۔"

کنول نے آگے بڑھ کر کانپتے ہاتھوں سے توقیر کے پہلے بازو ناپے پھر چھاتی ناپی اور پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ماں جی!"

"تمہارے لیے ایک جرسی بنا رہے ہیں بیٹا!"

توقیر نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"اف! آپ کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ اس قدر اہتمام مجھے ایک بات کہنی ہے ہم جیسے غریب گھرانے اس طرح خرچ نہیں کرتے۔ لیکن اپنی حالت دیکھی آپ نے۔"

یہ فضول خرچی نہیں بیٹا! ہم نے جو کچھ کیا ہے اپنے وسائل سے باہر ہو کر نہیں کیا۔

توقیر ہار مان کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے تو اب اجازت دیجئے۔ چلتا ہوں"

"پھر جلدی چکر لگانا۔" جمیلہ نے بیتابی سے کہا۔

"ضرور آؤں گا۔"

کپڑے اٹھا کر توقیر باہر نکل گیا۔

سردی خوب زوروں کی ہوگئی تھی۔ راتیں پھیل گئیں اور دن خوب سمٹ گئے
سردی اور جاڑا ہر سو ناچ اُٹھے۔ دُور دُور تک درختوں پر ویرانی ہی ویرانی چھا گئی
طرح برجیس کا دل اور ذہن بھی ویران تھے۔ اس کا خیال تھا کہ توقیر اسے بہت جلد
دے کر فارغ کر دے گا اور وہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے گی۔ لیکن توقیر تو اس دن
بعد لوٹا ہی نہ تھا۔ برجیس کو تو اس کے گھر تک کا بھی پتہ نہ تھا۔ نہ ہی شرم کے باعث
سے پوچھتی تھی کہ خود ہی جا کر اس سے بات کرے۔ سا

دن بدن اس کی بیتابی بڑھتی جا رہی تھی۔
اُلجھ جاتی تھی وہ بار بار اپنی کھوئی تقدیر کے اُلجھے تاروں میں۔ شادی کیا ہوئی
کا پھندا پڑ گیا گلے میں۔ کیا خبر تھی ساری آرزوئیں بھاپ کی طرح اُڑ جائیں گی۔

وہ پہروں بیٹھی سوچتی رہتی۔ جائزہ لیتی رہتی۔
اپنی کھوئی تقدیر کے ان سکوں کا جو چھن سے اس کے سامنے پھینک دیئے گئے تھے
اپنی ان حسرتوں کا جو ناکامیوں کے میدان میں پھسل کر بہت دور چلی گئی تھیں۔
ان لمحات کا جو زندگی کے دوسرے ساحل پر کھڑے اب اس کا مُنہ چڑا رہے تھے۔
اس کے دل میں درد تھا۔
سوز آمیز دکھ تھا۔ اور
اور آنکھوں میں ویرانی کی اُڑتی ہوئی دھول تھی۔ ویرانی۔
جو ہنستے مسکراتے ماحول میں رچ بس کر دُکھ اور غم کا غبار بنا کر رکھ دیتی ہے۔
آج صبح بھی برجیس کی یہی حالت تھی۔ اپنے کمرے کے وسط میں انگیٹھی کے پاس
بیٹھی وہ نہ جانے کن تفکرات میں ڈوبی تھی۔ باہر زرد زرد سی دھوپ پھیلی تھی۔ کوٹھی کے
باہر کسی کے گھر میں پیپل کا درخت کسی ودھوا کی اُجڑی ہوئی مانگ کی طرح کھڑا تھا۔ کچھ
سوچ کر وہ اٹھی اور باہر آئی۔ برآمدے میں کریمن بُوا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔
"کہاں چلی ہو بیٹی!" کریمن نے پیار سے پوچھا۔
برجیس کے لہجہ میں الجھاہٹ تھی۔
"ذرا بازار جا رہی ہوں بُوا۔"
برآمدے سے نکل کر اس نے کار نکالی اور بازار چلی گئی۔ اِدھر اُدھر وہ پھرتی رہی بس
یونہی سکون کی تلاش میں۔ کپڑے کی دوکان سے اس نے ایک ساڑھی خریدی۔ ضرورت تو
نہ تھی۔ صرف وقت گزارنے والی بات تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ فروٹ مارکیٹ جا گھسی۔

اور یونہی بے خیالی میں جانے کیا کیا خرید ڈالا۔ اس سے بھی وہ آگے بڑھی اور گوشت ا
دکانوں کے پاس سے گزرتی ہوئی وہ مچھلی مارکیٹ میں جا داخل ہوئی۔ بیکار سی چیزا
کے بھاؤ پوچھتی ہوئی وہ آگے بڑھ رہی تھی کہ ایک جگہ جم کر ہی رہ گئی۔

اسے اپنی بصارت پر شبہ ہونے لگا۔

ذہن کا کوئی دور دراز کا کونا ہلکے سے پکارا۔

میں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔

لیکن کسی دوسرے روشن پہلو نے اس کی تردید کر دی۔

نہیں نہیں یہ حقیقت ہے۔

سامنے ایک بوسیدہ سے چھپر کے نیچے توقیر کھڑا مچھلیاں بیچ رہا تھا۔ آس پا
بہت سے مچھیرے بھی بیٹھے تھے۔ اس کے دائیں طرف غیاث اور مسعود بھی اپ
لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔

برجیس نے گہری سنجیدگی سے سوچا۔

یہ تو کسی بڑے جاگیر دار کا لڑکا تھا۔ یہ یہاں اس کام میں کیسے۔

اس کا ذہن کچھ الجھنے لگا۔

کچھ سوچ کے وہ بے محابا آگے بڑھی اور کسی قدر تعجب کا اظہار کرتے ہو
بھاؤ پوچھا۔ توقیر بھی اسے پہچان چکا تھا۔ بالکل اجنبی بن کر سنجیدگی سے اس نے
بتا دیا۔

برجیس پھر بولی۔

"اچھی مچھلی ہے کہاں سے پکڑ کر لائے ہیں۔"

توقیر نے کاروباری انداز میں کہا۔

"آپ کو آم کھانے سے غرض ہے بیگم صاحبہ پیڑ گننے سے کیا غرض۔"

برجیس دھیرے سے مسکرا دی۔

"اس کام میں اناڑی دکھائی دیتے ہو تبھی گاہک سے بات کا کوئی تجربہ نہیں۔"

"آپ بھول رہی ہیں یہ میرا خاندانی پیشہ ہے۔" توقیر نے جیب سے سگریٹ نکالا
اور سلگا کر پینے لگا۔

"ان سب کا کیا لوگے۔" برجیس نے پھر پوچھا۔

"آٹھ روپے۔"

"بہت کم بتاتے ہیں تم نے۔" برجیس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں۔"

برجیس نے سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"اچھا یہ لو۔"

توقیر جان بوجھ کے جاہل بن گیا اور مچھیروں کے انداز میں کہا۔

"میں گریب مچھیرا ہوں بیگم صاحبہ۔ میرے پاس سو کا کھلا کہاں۔"

"تم سب رکھ لو۔ میرا تمہارے پاس حساب چلتا رہے گا۔ اب میں تم سے مچھلیاں
خریدتی ہی رہوں گی۔"

توقیر نے بڑی خوبصورتی سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"توبہ توبہ۔ مجھ سے اگر اتنی بڑی رقم گم ہو گئی تو؟ میرا تو باپ بھی پوری نہ کر سکے گا مہربانی کریں کسی اور سے خرید لیں مچھلی۔"

اتنے میں ایک طرف سے غیاث آیا اور توقیر کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے سے کہا۔

"بے سگریٹ کا کش ہی دو ایک۔"

توقیر نے سگریٹ اسے تھما دیا۔

برجیس پھر بولی۔

"عجیب آدمی ہو بھائی۔ تم اگر نہیں رکھنا چاہتے تو کسی اور سے کھلا پکڑ لو نا۔"

اس بار غیاث نے پوچھا۔

"کیا بات ہے۔ بیگم صاحب؟"

"اس سے یہ ساری مچھلی لی ہے آٹھ روپے ہیں اور سو کا نوٹ دے رہی ہوں ہے میرے پاس کھلا نہیں کسی اور سے خرید لو جا کر۔"

غیاث نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"کیوں بے! ایسے بات کی جاتی ہے گاہک سے۔ تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا بیگم صاحب مجھے دیجئے نوٹ۔"

غیاث نے جیب سے نوٹوں کی گٹھی نکالی۔ برجیس سے سو کا نوٹ لے لیا۔ توقیر کو دیتے ہوئے کہا۔

"چل پکڑ۔"

"مجھے کوئی مزدور بھی کرا دو بابا پچھڑے میں ڈال کر جو میرے ساتھ چلا جائے۔" برجیس نے غیاث سے کہا۔

"سڑک پر میری کار کھڑی ہے ساتھ بیٹھ کر چلا جائے۔ میں واپس بھی چھوڑ جاؤں گی۔"

غیاث نے تیزی اور خوشی سے کہا۔

"اسے دو روپے مزدوری کے اور دیجئے۔ یہی چلا جاتا ہے اور چھوڑ آئے گا۔"

برجیس نے دو روپے نکال دیئے۔ غیاث نے وہ روپے بھی توقیر کی جیب میں اڑس دیئے۔

"چل بے اٹھا اپنا پچھڑا اور لے جا۔"

توقیر کچھ سوچنے لگا۔

غیاث نے خود ہی قریب پڑا ہوا پچھڑا اٹھایا جلدی جلدی ساری مچھلیاں اس میں ڈالیں اور اٹھا کر توقیر کو تھماتے ہوئے کہا۔

"سوچنے سے مجدور کا کام نہیں چلتا۔ اٹھا اور لے جا۔"

توقیر نے پچھڑا اٹھا لیا۔

غیاث نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

شاباش شاباش۔ لے جاؤ لے جاؤ اور موج مارو موج۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں خوش قسمت ہو جو اس قدر جلدی بک گئی ہیں۔ جاؤ جا کر نہا دھو کے آرام کرو۔"

توقیر مچھلیاں اٹھائے برجیس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں سڑک پر آئے۔ برجیس نے پچھڑا اسپنٹی میں رکھوایا۔ توقیر پیچھے بیٹھ گیا۔ برجیس بڑے پیارے انداز میں اپنی ساڑھی کا پلو سمیٹتی ہوئی آگے بیٹھی اور کار سٹارٹ کر دی۔

ابھی تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ برجیس نے پوچھا۔

"آپ کب سے یہ کام کرتے ہیں؟"

توقیر نے لاپروائی سے کہا۔

بچپن سے۔

"بھائی جان نے تو مجھے آپ کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔"

توقیر نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"کون بھائی جان ؟"

"قیصر بھائی اور کون۔"

"میں تو کسی قیصر کو نہیں جانتا۔"

"اب بننے سے کیا حاصل پردہ تو آپ کا راز فاش ہو ہی گیا ہے۔"

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ میں کسی قیصر کو نہیں جانتا۔"

برجیس نے رخ پیچھے کرتے ہوئے چبھتی نگاہوں سے پوچھا۔

"آپ کا نام توقیر نہیں ہے؟"

"کیا نام ہے آپ کا پھر؟"

"میرا نام توراج ہے۔"

"مجھے جانتے ہیں آپ۔"

"نہیں ؟"

"اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا مجھے۔"

توقیر نے نفی میں سر ہلایا۔

"اوں ہوں۔"

"حیرت ہے۔" برجیس نے تعجب سے کہا۔ "آپ رہتے کہاں ہیں ؟"

توقیر عجیب طرح سے جھوٹ بول رہا تھا۔

"مچھروں کی بستی میں۔"

"کچھ پڑھے لکھے بھی ہیں۔"

"بالکل اَن پڑھ۔"

برجیس نے کار روک دی۔

"یہ ہے آپ کا گھر۔" توقیر نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"توقیر نے نیچے اُتر کر پچھڑا نکالا۔"

"کہاں رکھیں گی یہ؟"

برجیس نے اداس اور مدھم آواز میں کہا۔

اندر لے چلیں۔

توقیر دائیں ہاتھ میں اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

برجیس نے پچھڑا دالان میں رکھوایا اور ملازمہ کو آواز دی۔

"کریمن بُوا۔"

کریمن باہر آئی۔ توقیر کو اس نے نہیں دیکھا۔ وہ ستون کی اوٹ میں تھا۔

"اتنی مچھلی آپ اٹھوا لائیں۔ کیا کریں گی۔"

برجیس کی آواز میں دکھ کا شائبہ تھا۔

"سب محلے والوں میں بانٹ دو بُوا!"

کریمن حیرت سے برجیس کو دیکھنے لگی۔

جونہی وہ تھوڑا سا آگے بڑھی اس کی نظر توقیر پر پڑی۔

"آپ کب آئے ہیں صاحب اور یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔"

توقیر نے چہرے پر حیرت بکھیر لی۔

"مجھ سے کچھ کہا ؟"

کریمن بہت خوش ہوئی جا رہی تھی۔

"ہاں ہاں آپ سے ہی تو کہا ہے۔ اتنے دن غائب رہے۔ مڑ کر ہماری خبر ہی
لی۔ خدا گواہ ہے برجیس تو ہر وقت اداس اور بے چین رہتی تھیں۔ ہر روز آپ کا ا
تھا۔ پر آپ تو جانے کہاں کھو گئے۔" کریمن ایک ہی سانس میں کہہ گئی۔

توقیر نے اُداسی سے کہا۔

"آپ لوگ مجھے پہچاننے میں غلطی کر رہے ہیں۔"

کریمن بُوا پھر بھی مُسکرا دی۔

"واہ۔ یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ آپ کیا ہماری بٹیا کے۔"

"دیکھئے نا۔"

"آپ کا نام توقیر ہے نا۔"

"ہرگز نہیں۔"

"ہائیں۔ تو کون ہیں آپ ؟"

"میرا نام تو راجو مچھیرا ہے۔"

کریمن نے پیشانی پر ہاتھ دے مارا۔

"کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ بٹیا کیا چکر ہے یہ۔" اس نے برجیس سے پوچھا۔

برجیس کچھ اُداس تھی۔

"میں خود نہیں سمجھ پائی بُوا یہ کوئی اور ہیں۔ مچھلی مارکیٹ میں مجھے یہی شک گزرا تھا۔
لیکن یہ اپنے متعلق کچھ اور ہی بتاتے ہیں۔"

توقیر اور انجان بنا۔

"آپ لوگوں کا کوئی آدمی گم ہو گیا ہے۔"

کریمن نے کہا۔

"ہاں۔ بٹیا کے شوہر کہیں چلے گئے ہیں۔ واپس نہیں آرہے۔ ہم بہت پریشان ہیں۔"
کریمن نے دُکھ سے کہا۔

"بہت بدقسمت انسان تھا جو ایسے جنت نما گھر کو چھوڑ کے چلا گیا!"

کریمن نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا! بس نصیبوں کی بات ہے۔"

"میرا چھکڑا تو خالی کر دیں مجھے جلدی جانا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

کریمن نے چھکڑا خالی کر دیا اور توقیر اسے اٹھا کر چل دیا۔ کریمن اور برجیس دروازے تک
اسے بڑے دکھ اور حیرت سے دیکھتی رہیں۔ توقیر پیچھے دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔

انیس اب بڑی تیزی سے کنول کے قریب تر ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ فر[خندہ]
کے ساتھ روزانہ کنول کو کالج لے جاتا اور لے آتا۔ اکثر وہ کنول کو ہلکے ہلکے مذاق بھی کر[تا]
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کنول چپ رہتی۔ بیچاری ایک تو فطری شرم کے
دوسرے وہ اس سے زیادہ باتیں کر کے کچھ فری بھی ہونا نہ چاہتی تھی۔ فرخندہ کے مجبور کر[نے]
پر وہ ان کے ساتھ کالج آجا ضرور رہی تھی۔

اکثر وہ واپس جاتے ہوئے کنول کے ہاں چائے بھی پیتے۔ کنول بیچاری کیا کر[تی]
بھی تو نہ کیا جا سکتا تھا۔ فرخندہ جو ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ دن کچھ اسی طرح گزرتے ج[ا]
رہے تھے۔

آج ہفتہ کے روز کنول کو کالج سے واپس لاتے ہوئے انیس اور فرخندہ پھر ا[س کے]

ہاں بیٹھ گئے۔ کنول نے چائے بنائی اور تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پینے لگے۔ کمرہ ایک غریب کی حیثیت کے مطابق اچھا ہی سجا ہوا تھا۔ فرش پر دری تھی۔ ایک صوفہ سیٹ چند آفس چیئر دو تپائیاں۔ کچھ درانڈہ چیئر ایک کونے میں چھوٹا سا میز۔ بس ایسا ہی کچھ اور سامان بھی تھا۔

چائے کی ایک گہری چسکی لے کر فرخندہ نے کہا۔

"کنول!"

"جی" کنول نے چائے کی پیالی تپائی پر رکھ دی۔

"میں نے اپنی امی سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتی ہیں۔ کل تم ہمارے ساتھ چلوگی نا۔"

کنول نے سنجیدگی سے کہا۔

"سوچوں گی۔"

فرخندہ نے جھٹ کہا۔

"سوچنے کی بھلا کیا بات ہے۔ میں تمہیں سینما یا کلب جانے کو تو نہیں کہہ رہی۔"

"ایسی بات ہوتی تو میں اسی وقت ہی انکار کر دیتی۔"

"کیوں۔ اتنی نفرت ہے کلب سے۔"

"بالکل۔ شریف عورتیں کلب تھوڑا ہی جاتی ہیں۔"

چہ چہ چہ۔ بیچاری لڑکیاں۔ کیا فائدہ تم جیسی لڑکیوں کی تعلیم کا کیا کروگی پڑھ لکھ کر۔ کلب جانے سے مردوں کے اطوار کا پتہ چلتا ہے۔ نئے نئے تجربات حاصل ہوتے ہیں جو بہتر زندگی گزارنے میں کافی مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور ساتھ ہی دوستوں کی تعداد میں بھی

اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

کنول نے چڑ کے کہا۔

"ایسی مغربیت تو مغرب ہی کو مبارک۔"

"تو تم بھی مغربی تہذیب کے خلاف ہو؟"

"خلاف نہیں۔ پر ہمیں صرف اس میں سے اچھی باتیں اپنا لینی چاہئیں اور بُری باتوں کو حقارت کے ساتھ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں پھینک دینا چاہیئے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے۔ خذ ما صفا ودع ما کدر۔ میں تو اس کی پابند ہوں۔ اندھوں کی طرح چیز کو اپنانے کے میں خلاف ہوں۔"

"لیکن یہ بھی تمہیں یاد ہونا چاہیئے کہ مغربی تہذیب کی بدولت یورپ نے جو ترقی کی آج سب مشرقی ممالک اسی کی تقلید میں بھاگ رہے ہیں۔"

کنول نے بھرپور طنز کیا۔

"تو کیا مغرب کی یہ ترقی عورت کے کلب جانے کی وجہ سے ہے۔"

فرخندہ جھنجھلا گئی۔

"پڑھ لکھ کے بھی بس یوں ہی رہی ہو؟"

کنول نے اور تیر مارا۔

تم بار بار تعلیم پر کیوں طنز کرتی ہو۔ تعلیم انسان کی بیہودگی اور اخلاقی کمزوری کا سبق نہیں دیتی۔ نہ ہی تعلیم یہ کہتی ہے کہ عورت کو کلب جا کر مردوں کے دوش بدوش رقص ناچنا چاہیئے۔"

انیس نے بھی دخل اندازی کی۔

"کیا فضول بحث لے بیٹھی ہو تم دونوں۔ کوئی اور بات کرو۔"

فرخندہ مسکرائی۔

"اچھا کنول! کل اتوار ہے۔ میں تمہیں پچھلے پہر ضرور لینے آؤں گی۔"

کنول نے ہاں پھر بھی نہ کی۔

"امی سے پوچھوں گی۔ انہوں نے اگر اجازت دی تو چلی جاؤں گی۔"

فرخندہ کھڑی ہو گئی۔

"میں خود پوچھ لوں گی تمہاری امی سے۔"

انیس اور فرخندہ چلے گئے۔ کنول اپنی امی کے پاس آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پروین آ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ادھر اُدھر کی دُکھ سُکھ کی کرنے لگی۔

دوسرے روز دوپہر کے قریب انیس اور فرخندہ پھر آ دھمکے۔ جمیلہ سے انہوں نے نہایت چاپلوسی سے کنول کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لے لی۔ کنول کپڑے لینے چلی گئی۔ انیس اور فرخندہ جمیلہ کے پاس ہی بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد کنول بھی اپنے کمرے سے نکلی۔ ساڑھی پہنے ہوئے وہ

"اُف توبہ"

گویا سفید براق گردن میں کسی نے خوبصورت اور انمول موتیوں کا ہار پہن لیا ہو ہر طرح سے آراستہ تھی۔

تیر نظر تھے۔

شمشیر ابرو تھی۔

خنجر مژگاں بھی تھے۔

غازہ پاوڈر کے استعمال کے بغیر ہی وہ

پری شمائل اور حور تمثال تھی۔

انیس نے شوخ چتونوں سے اسے دیکھا اور اس کی مے آشام آنکھوں
گھومتا گیا۔

فرخندہ نیچی سی آواز میں بڑبڑائی۔

" چشم بد دور "

کنول دونوں کے ساتھ ان کے ہاں پہنچی۔ انیس اس کے پاس ہی ڈرائنگ میں بیٹھ گیا۔ فرخندہ دوسرے کمرے میں اپنی امیّ کو بلانے چلی گئی۔ چند ہی ساعتو وہ ایک بھاری جسم کی باوقار سی عورت کے ساتھ اندر آئی۔ نووارد جس کا نام سکینہ کنول کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ فرخندہ نے جھٹ سے دونوں کا تعارف کرا دیا۔

سکینہ نے بیٹھتے ہی کنول سے کہا۔

" فرخندہ بہت دنوں سے تمہاری تعریف کر رہی تھی۔ میں تو تمہیں دیکھنے ہی ہو گئی تھی۔ بالکل بیتاب ہی ہو گئی تھی۔ بالکل وہی ناک نقشہ اور صورت تمہاری جو میں نے اپنے ذہن میں بنائی تھی۔"

کنول مسکرادی۔

" فرخندہ تو یونہی سب کی تعریف کرتی رہتی ہے۔"

سکینہ نے ہنس کے کہا۔

"نہیں تمہیں دیکھا جائے پھر تو اس کی تعریف ٹھیک ہی ہے۔"

کنول شرما گئی۔

سکینہ نے دبے دبے لفظوں میں کہا۔

" مجھ پر تو ابھی بوجھ ہی بوجھ ہیں بیٹی! دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی تینوں کا ہی ابھی کرنا ہے بڑا لڑکا منیر تو وکیل ہے اور اس کی منگنی بھی ہو چکی ہے۔ دوسرا انیس تمہارے منے بیٹھا ہے یہ اپنے ابّا کے ساتھ کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ سوچتی ہوں فرخندہ بی ایس کرے تو تینوں کا اکٹھا ہی کچھ کر دوں۔"

کنول چپ رہی جواب میں کچھ بھی نہ کہا۔

اور اتنی دیر میں چائے کی ٹرالی لے آئی اور سب کو باری باری چائے پیش کرنے لگی

خاموشی سے سب چائے پی چکے تو سکینہ پھر کنول سے مخاطب ہوئی۔

" فرخندہ کہہ رہی تھی تم اس کے ساتھ ہی پڑھتی ہو۔"

کنول نے بڑی شائستگی سے کہا۔

" جی ہاں! "

" رہتی کہاں ہو۔"

" کریم آباد۔"

" کریم آباد؟" سکینہ نے اس انداز سے پوچھا جیسے اسے سخت حیرت ہوئی ہو۔

" کیا کرتے ہیں تمہارے ابّا؟"

کنول کچھ اداس ہوگئی۔

"فوت ہو چکے ہیں۔"

"اچھا۔ بھائی ہوں گے پھر۔"

"جی نہیں بھائی بھی کوئی نہیں۔"

"حد ہے۔"

"بس میں اور میری امی ہیں۔"

"سکینہ نے جستجو سے پوچھا۔"

تو تمہارے کاروبار کی دیکھ بھال کون کرتا ہوگا۔"

کنول نے بے ساختہ کہا۔

"کاروبار تو ہمارا ہے ہی نہیں۔ صرف میری امی کی پنشن ہے۔ جس سے ہم ماں بیٹی بسر اوقات کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور ہمارا ذریعہ ہی نہیں"

سکینہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"حیرت ہے۔"

سکینہ کھڑی ہوتی ہوئی فرخندہ سے بولی۔

فرخ! تم ذرا بیٹھو اس کے پاس میں آتی ہوں تھوڑی دیر تک۔"

سکینہ ڈرائینگ روم سے نکل گئی۔ انیس اور فرخندہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔

کنول پریشان بیٹھی تھی۔

بس اُلجھی اُلجھی سی۔

کچھ نہیں آرہا تھا، سمجھ میں۔

ایک دم اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

ساتھ والے کمرے سے کسی کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

پہلے فرخندہ کی آواز آئی۔

"امی! کنول پسند آئی آپ کو۔"

سکینہ نے غصے میں کہا۔

"تم دونوں بھائی بہن کا تو دماغ چل گیا ہے۔ ایسی لڑکی کو اس گھر میں لانا چاہتے ہو جن کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہیں۔ انیس کی بیوی وہ لڑکی بن کر آئے گی جس کے ماں باپ ہیں لڑکی کے ساتھ لاکھوں کا جہیز دیں اور پورے شہر کو پتہ چل جائے کہ میرے انیس کی کسی کے ہاں شادی ہوئی ہے۔"

فرخندہ نے منت کے انداز میں کہا۔

"ایسی خوبصورت لڑکی کہیں نہیں ملے گی امی جان!"

سکینہ نے تلخی سے کہا۔

"جہنم میں جائے ایسی خوبصورتی۔"

"امی! بھائی جان اسے چاہتے بھی تو ہیں۔"

"اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ اس گھر میں بہو میری پسند کی آئے گی۔"

"سوچ لیں امی!"

" بس تم چپ رہو۔ یہ شریف اور معزز لوگوں کا گھر ہے۔ کوئی یتیم خانہ نہیں کہ تم اِ
بھٹکتی ہوئی لاوارث سی لڑکیاں پکڑ لاؤ یہاں۔"

فرخندہ چپ ہو گئی۔

کنول نے جب یہ باتیں سنیں تو مارے غصے کے آگ بگولا ہو گئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی
فرخندہ اسے اس مقصد کے لیے اپنے گھر لائی ہے۔ غصے میں وہ بار بار اپنی جگہ پر پہلو
جا رہی تھی۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا گویا پورا کمرہ گھوم رہا ہو۔

فرخندہ اترا ہوا چہرہ لیے کمرے میں آئی۔

کنول غصے میں پھٹ پڑی۔

فرخندہ کب میں تمھیں یہ حقوق دیے تھے کہ تم مجھ سے پوچھے بغیر میرا رشتہ کہیں
کرتی پھرو۔ میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی بہن اور تمہارے بھائی کو اپنا بھائی سمجھا۔ پھر تم
اتنی بڑی جرأت کیوں کی۔"

"فرخندہ ہکلانے لگی"

" دیکھو کنول

کنول پھنکارتی ہوئی اٹھی اور اس کے منہ پر بھرپور طمانچہ دل سے داغ دیا۔

" ایڈیٹ! آئندہ اگر تم میرے ہاں آئیں تو جھونٹے نوچ لوں گی تمہارے۔"

کنول غصے میں بل کھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

فرخندہ دھم سے ایک صوفے پر گر گئی۔

فرخندہ کے ہاں سے نکل کر کنول بس کے انتظار میں لارنس چوک پر آکھڑی ہوئی
ابھی تک اس کا جسم کسی مدقوق کی طرح کانپ رہا تھا۔ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور ذہن
یوں تھا گویا آگ کی کوئی بھٹی بھڑک اٹھی ہو۔

سکینہ کے کہے ہوئے الفاظ

فرخندہ کا ایسا ناروا رویہ

سب ابھی تک اس کے ذہن میں سلگاہٹ پیدا کر رہے تھے۔

شام ہونے کو تھی لیکن ابھی تک بس نہ آ رہی تھی۔ وہ بہت پریشان ہوتی جا رہی تھی
ایک تو فرخندہ کے ہاں اٹھائی ہوئی جھنجھلاہٹ اور شرمندگی دوسرے انتظار کی کوفت سخت
اور ہو رہی تھی۔ دفعتہً ایک طرف سے گدھا گاڑی آئی۔ کنول نے دیکھا اس میں مسعود
کے ساتھ توقیر بیٹھا تھا اور اس میں مچھلیوں سے بھرے پچھڑے بھی پڑے تھے۔ گدھا

گاڑی بوڑھا غیاث چلا رہا تھا۔

کنول کی سوچیں دوسری طرف اُلجھ گئیں۔

توقیر چوک پر آکر اُتر گیا اور گدھا گاڑی آگے بڑھ گئی۔ کنول اُداس ہوگئی۔ توقیر اب میلے کچیلے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ کنول کو شاید اس نے نہ دیکھا تھا۔ تبھی وہ چوک پر اُترتے ہی اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ کنول نے فوراً سوچا پھر بیتابی سے پکاری "توقیر!"

توقیر نے ایک دم سے مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ سڑک کے اس پار کنول کھڑی تھی۔ توقیر واپس چپ چاپ اس کے پاس آیا۔ اور اِدھر اُدھر کھڑے لوگوں کا خیال رکھتے ہوئے ہلکی سی آواز میں پوچھا۔

"اس وقت یہاں کیوں کھڑی ہو کنول!" توقیر نے نرم لہجہ میں پوچھا۔

کنول پہلے ہی دکھی ہو رہی تھی۔ توقیر کے الفاظ نے اور اثر کیا۔ اس کا جی چاہا بھاگ کر توقیر سے لپٹ جائے۔ اور سارے دکھ غم بھول جائے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

توقیر پریشان ہوگیا۔

"کیا بات ہے کنول! رو رہی ہو تم"

کنول سِسک پڑی۔

توقیر

گھبرا گیا۔

"تمہاری امی تو ٹھیک ہیں کنول!" توقیر نے اندازاً اپنا خیال ظاہر کیا۔

کنول نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

توقیر نے اور نرم لہجے میں پوچھا۔

"پھر کیا بات ہوئی۔ کچھ بتاؤ تو سہی نا۔"

کنول نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس سٹاپ پر کھڑے لوگوں کے دوسری سمت مُنہ کر کے روتی رہی۔

توقیر زیادہ بیتاب ہوگیا۔

"دیکھو کنول اپنے آنسو پونچھ لو اور آؤ میرے ساتھ"

کنول چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے ہولی۔

دونوں چوک والے ہوٹل کے کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ توقیر نے بیرے کو چائے کا ادہ ابھی تک خاموشی سے کنول کو گھورتا جا رہا تھا۔ کنول اب کچھ کچھ سنبھل گئی تھی۔ ا چائے رکھ گیا۔ توقیر اب بھی خاموش تھا۔ کنول نے چائے بنائی۔ دونوں پینے لگے۔ فیر نے ابھی تک کچھ نہ پوچھا۔ چائے پی چکے تو توقیر نے کہا۔

"کیا بات ہوئی کنول! مجھے تمہاری حالت دیکھ کر سخت دکھ ہو رہا ہے۔"

کنول نے سر جھکا لیا۔

توقیر نے پیار سے پوچھا۔

"بولو نا" توقیر کی آواز میں دُکھ تھا۔

کنول نے انیس اور فرخندہ کی حرکت تفصیل سے سُنا ڈالی۔

توقیر تلخ سی ہنسی ہنس دیا۔

"بس اتنی سی بات۔ ہم غریب لوگ ہیں کنول! دولت کے   تو ہم جیسوں سے اس سے بھی بدترین مذاق کرتے ہیں۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ بس ایک ہی علاج ہے اس کا ایسے لوگوں سے میل جول ہی ترک کر دو۔"

کنول نے غصے میں کہا۔

"میں تو اب اس کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی"

توقیر نے پیار سے انداز میں کہا۔

"بس بہت اچھی منی ہے ہماری"

شرم سے کنول کا چہرہ گرم ہوگیا۔ اور ساڑھی کا پلو اس نے دانتوں میں دبالیا

"عمر میں آپ کے برابر تو ہوں گی"

"کتنی عمر ہوگی تمہاری؟"

بیس کے لگ بھگ تو ہوگی"

"پھر میری ہم عمر کیسے ہوئیں۔ میں تو اس وقت پچیس کے پھیرے میں ہوں گا"

کنول ہنس دی۔

"چھوٹے۔ بیس سے زیادہ کیا ہوں گے۔"

توقیر کھڑا ہوگیا۔

"چلنا نہیں کیا۔"

"ایک بات بتایئے پھر چلتے ہیں"

توقیر پھر بیٹھ گیا۔

"کہو"

"یہ آپ نے لیں کنول سا پہن رکھا ہے"

توقیر ہنس دیا۔

"جیسا دیس ویسا بھیس مطلب ہے جس طرح کا کوئی کام کرے لباس

اس کے مطابق ہی پہنتا ہے"

کنول نے دکھ سے پوچھا۔

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"دیکھو منی میں نے پہلے بھی ایک بار تمہیں کہا تھا کہ غریب کو اس بے رحم زمانے میں زندہ رہنے کے لیے انتھک محنت اور جد وجہد کرنا پڑتی ہے۔ محنت سے کترانے والے غریب یا تو در بدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں یا بھکاری بن کر قوم و ملک کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کرتے ہیں خواہ مزدوری کیوں نہ کرے اپنا پیٹ تو خود محنت کر کے بھرنا چاہیئے۔ بیکار انسان نے تو معاشرے کے لیے ایک نیا مسئلہ پیدا کرتا ہے۔"

توقیر سانس لینے کو رکا۔

"میں نے بی۔ اے کے بعد سروس کی انتھک کوشش کی۔ جب ہر طرف سے مایوس ہوگیا اور کہیں ملازمت نہ ملی تو میں مزدوری کر کے اپنا اور گھر کے افراد کا پیٹ پالنے لگا۔ ہر روز پچھلے پہر مچھلی پکڑتا ہوں اور دوسری صبح بازار بیچ دیتا ہوں سات یا آٹھ روپے روز کے آجاتے ہیں۔ اور زندگی کے دن انہیں میلے کچیلے کپڑوں میں ہنسی خوشی گزار رہے ہیں مچھیرے سب مجھے پیار سے راجو مچھیرا کہتے ہیں۔"

کنول اداس ہوگئی اور سر جھکا لیا۔

"کیوں تمہیں ایسا کام پسند نہیں۔"

کنول نے جلدی سے کہا۔

"یہ بات نہیں۔ مجھے صرف آپ کی حالت دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔"

توقیر نے ازراہ مذاق کہا۔

"دیکھو منی! تم تو کل کو ڈاکٹر ہو جاؤ گی۔ اور میں وہی بی۔ اے کا بی۔ اے پھر
تم شاید مجھ سے بات بھی کرنا پسند نہ کرو۔"

کنول نے اسے تیز نگاہوں سے گھورا۔

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو بھول جاؤں جس
طرح مچھلی پانی سے باہر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح میں بھی ہو سکتا ہے۔ آپ کے
بغیر ــــــ" کنول آگے خاموش ہو گئی۔ اور شرما کر سر جھکا لیا۔

توقیر کنکھیوں سے اسے دیکھ کر مسکرایا۔

"نوازش ہے تمہاری"

کنول نے سر اوپر اٹھایا۔

"چلنا چاہیئے۔"

"ہاں چلیں۔"

دونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔ توقیر نے ادھر اُدھر دیکھا کوئی ٹیکسی یا رکشا نہ تھی دونوں
ٹیلیفون کے کھمبے کے پاس قریب قریب کھڑے ہو گئے۔ کنول کو کوئی بات سوجھی۔

"ابھی آپ میرے ساتھ گھر چلیں گے نا"

"نہیں آج نہیں۔ کل آؤں گا۔ آج میں تمہیں صرف گھر تک چھوڑ آؤں گا"

کنول نے خفگی سے کہا۔

"یہ کیا تک ہوئی۔ میں ضرور ساتھ لے کے جاؤں گی۔"

"میرا ابھی جانا ہی ضروری ہے کیا؟"

"بالکل"

"کیوں؟"

"میں نے آپ کی جرسی بنا کر رکھی ہوئی ہے۔ وہ لینے آیئے گا۔ امی کہہ رہی تھیں
دفعہ پہن کر دکھا دیں"

"مجھے بھی پتہ چل جائے گا کہیں سے تنگ تو نہیں رہ گئی"

"اوں ہوں"

توقیر نے التجا کے انداز میں کہا۔

"دیکھو کنول میرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں آج وعدہ کرتا ہوں کل ضرور
آؤں گا۔ کھانا بھی وہیں کھاؤں گا اور رات بھی ادھر ہی رہوں گا"

کنول کھل گئی۔

"سچ؟"

"ہاں تو آج اگر ساتھ لے جاتی ہو تو میں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا آؤں گا۔ اور اگر کل
ے مان جاؤ تو رات بھی وہیں رہوں گا۔"

"رات رہنے کی پکی بات ہوئی نا"

"بالکل"

"ٹھیک ہے کل ہی آپ کا انتظار کروں گی۔"

توقیر نے ایک لمبا سانس لیا۔

"شکر ہے تم مانی تو ہو۔ اور سناؤ تمہاری امی جان کی صحت کیسی ہے؟"

کنول افسردہ ہو گئی۔

"ایسی ہی ہے جس طرح آپ دیکھ آئے تھے"

توقیر نے گہری آواز سے کہا

"خدا انہیں صحت دے۔"

اتنے میں ایک طرف سے خالی رکشا آگئی۔ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ کنول کو
توقیر نے اس کے گھر کے سامنے اتار دیا۔ اور رکشا میں ہی اپنے گھر چلا گیا۔

کنول اُداس اُداس سی گھر میں داخل ہوئی۔ جمیلہ پلنگ پر لیٹی نہ جانے کن
سوچوں میں الجھی پڑی تھی۔ کنول کو دیکھتے ہی وہ پیار سے بولی۔

"آگئی ہو بیٹی!"

کنول کی آواز میں ہزاروں دکھ جھلک رہے تھے۔

"جی۔ آپ نے دوا پی ہے۔"

پی لی ہے بیٹی! کیا بات ہے تمہارا چہرہ کیوں سُرخ ہو رہا ہے جھگڑا ہوا کسی
کنول پی گئی۔

"نہیں تو۔

"پھر کیا بات ہوئی؟"

"کچھ بھی نہیں امی! میں کسی سے جھگڑا کیوں کرنے لگی۔"

"اتنی دیر کر دی تم نے میں تو سخت پریشان ہو رہی تھی۔"

"بس ہی نہیں مل رہی تھی۔ توقیر مل گیا تھا۔ وہ یہاں تک رکشا میں چ
گیا ہے۔"

جمیلہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

تم اُسے ساتھ تو لائی ہوتیں۔"

"کہہ رہے تھے امی! کل آؤں گا۔ کھانا بھی یہیں کھاؤں گا اور رات بھی رہونگا۔"

"تم نے کہا تو ہوتا اپنی امی کو بھی ساتھ لائے۔"

"یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"پتہ نہیں اس لڑکے کو کیا ہوا ہے۔ باہر سے ہی چوروں کی طرح بھاگ جاتا ہے۔"

"میں نے بہت کھینچا امی! کہہ رہے تھے میرے کپڑے ٹھیک نہیں کل شام
ور آؤں گا۔"

"کیا تھا اس کے لباس کو؟

"ایک بات بتاؤں امی! اگر آپ روئیں نہ تب۔"

"بتاؤ بیٹی! مجھ بدبخت کے مقدر میں رونے کے سوا اور لکھا ہی کیا ہے۔"

"بس پھر نہیں بتاؤں گی۔"

"مجھے الجھن ہوتی ہے گی کنول ایک دو وعدہ کرتی ہوں میں ضبط کرلوں گی۔"

"بات یہ ہے کہ توقیر ___ کنول رُک گئی۔

"امی! توقیر بچارہ آج کل مچھلیاں پکڑ کر بیچتا ہے۔ میں چوک پر کھڑی تھی تو وہ ایک
ھا گاڑی سے اُترے تھے۔ چوک پر ہی مجھے مل گئے۔ کہہ رہے تھے ہر روز پچھلے
چھلیاں پکڑتا ہوں اور صبح مارکیٹ جاکر بیچ دیتا ہوں۔ ملازمت ان کو کہیں نہیں
ی! کہہ رہے تھے اسی میں سات آٹھ روپے روز کے ہو جاتے ہیں اور اچھی ہی
ہو رہی ہے۔ میلے سے کپڑے پہنے تھے بچارے نے مجھے تو امی بہت دکھ ہوا۔
ی حالت دیکھ کر۔"

جمیلہ خلا میں گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی جیسے اس نے ڈوپٹے

کے پلو سے پونچھ ڈالا اور پھر دھیرے سے لرزتی ہوئی آواز میں بڑبڑائی ۔

"ہاں بیٹی! کوئی تن دکھی کوئی من دکھی ۔ یہ پیٹ اس بچارے کو نہ جا
کیا کروا رہا ہے ۔ کتنا بھولا اور اچھا لڑکا ہے کیا ملا اسے پڑھائی کا ۔"

"آج کل تو پڑھائی کی کوئی قدر ہی نہیں رہی امی!"

"ہاں بیٹی! سچ کہتی ہو ۔ بی ۔ اے والے ایک اچھے اور سلجھے کیرکٹر
کی اگر یہ حالت ہے تو میٹرک والے کا کیا ہونا ہوگا ۔"

"میٹرک والے تو کئی بڑی اچھی پوسٹ پر ہوتے ہیں ۔"

"ایسے سب سفارشی ہوتے ہیں بیٹی ۔"

"آج کل سفارش ہی تو سب کچھ ہے امی! ان کی بھی کوئی ہوتی تو وہ
پھنس جاتے ۔" جمیلہ نے دکھ سے کہا ۔

"نہ جانے کب رشوت اور سفارش جیسی لعنتیں ہمارے ملک سے دفع

"میں امی! کھانا پکا لوں ۔" کنول نے باہر نکلتے ہوئے کہا ۔

"جلدی کر لو ۔ آج تو دیر ہی ہو گئی ہے ۔"

کنول کھانا پکانے کے کمرے میں گھس گئی ۔ پہلے تیل والے چولہے
رکھا پھر اس نے سٹوو گرم کیا اور چھوٹی چھوٹی چپاتیاں پکانے لگی ۔ اتنی د
نے پانی مانگا ۔ کنول گلاس میں نل سے تازہ پانی لے گئی ۔ جمیلہ نے چند ہی گھونٹ
تھے کہ گلاس اس نے منہ سے ہٹا دیا ۔ اور حیرت زدہ سی ہو کر بولی ۔

"صحن میں کوئی چیز گرنے کی آواز آئی ہے بیٹی ۔"

"کنول نے بھی اپنا شبہ ظاہر کیا ۔

"آواز تو مجھے بھی آئی ہے امی ۔"

"ذرا دیکھو تو باہر جا کر ۔"

کنول صحن میں آئی ۔ چاندنی رات تھی ۔ دیوار کے ساتھ کسی نے ایک بنڈل
گرایا ہوا تھا ۔ باہر کا دروازہ ابھی تک کھلا تھا ۔ کنول دبے پاؤں باہر آئی ۔ اور دروازے
والی دیوار کا موڑ کاٹ کر جب وہ سانڈ والی دیوار کی طرف گئی تو دیوار کے ساتھ کوئی مرد کھڑا
تھا کنول کے دیکھتے دیکھتے اس نے کچھ اور سامان اندر پھینکا ۔ کنول دبے پاؤں باہر
آئی ۔ اور دروازے والی دیوار کا موڑ کاٹ کر جب وہ سانڈ والی دیوار کی طرف گئی تو دیوار
کے ساتھ کوئی مرد کھڑا تھا کنول کے دیکھتے دیکھتے اس نے کچھ اور سامان اندر پھینکا کنول
پہچان گئی وہ توقیر تھا ۔ اب بے محابا وہ آگے بڑھی ۔ توقیر بھاگ جانا چاہتا تھا ۔ لیکن
سامنے گلی بند تھی ۔ بھاگنے کے لیے سڑک کی طرف جانا پڑتا تھا ۔ اور اس طرف کنول
تھی ۔ توقیر چپ چاپ دم سادھے دیوار کے ساتھ چپک گیا ۔

کنول کو شرارت سوجھی آگے بڑھ کر توقیر کا کان پکڑ لیا اور پیار سے کہا ۔

"اے مسٹر!"

توقیر چپ رہا اور چہرہ چھپا لیا ۔

"اجی حضور!"

توقیر سمٹ گیا ۔

"اے جناب والی!"

توقیر نے منہ دوسری طرف کر کے اپنا کان چھڑانا چاہا ۔

کنول نے اپنے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے سے اس کا کان
ذرا ہلکے سے کھینچا۔

"میں نے کہا او صاحب!"

وہ پھر چپ رہا

کنول نے دوسرے ہاتھ سے اس کا شانہ ہلایا۔

"توقیر!"

ہلکے سے اس نے کہا۔

"جی!"

"چلو اندر"

"نہیں میں نہیں جاؤں گا چھوڑو میرا کان"

کنول نے چاہت سے کہا۔

"نہیں چھوڑتی"

"کیوں!"

"پکڑے ہوئے چور کو بھی کسی نے چھوڑا ہے۔"

"میں چور تھوڑا ہی ہوں؟"

"اور کیا ہے۔ کئی ماہ سے میں تو آپ جیسے چور کو پکڑنے کی فکر میں تھی۔"

"اچھا چھوڑو نا اب"

"پہلے امی کے پاس چلیئے۔"

"کل آؤں گا۔"

"اوں ہوں۔ ابھی جانا ہوگا۔"

"دھونس ہے کیا؟"

"بالکل"

"پہلے کان چھوڑو پھر چلتا ہوں۔"

"کان تو میں نہیں چھوڑوں گی۔ اسی طرح چلنا ہوگا امی کے سامنے"

توقیر ہار مان گیا اور اس کے ساتھ چلنے لگا۔

کنول نے توقیر کو کان سے پکڑ کر جمیلہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"امی چور پکڑا گیا آج۔ یہ صاحب پھینکتے تھے ہمارے ہاں سامان"

جمیلہ نے سر اٹھا کر دیکھا

"ارے توقیر تم؟"

ہاں امی! یہی سامان پھینک رہے تھے میں نے جا کر موقع پر ہی پکڑ لیا۔

"بیٹھ جاؤ توقیر" جمیلہ نے کہا۔ "یہ تم نے کیا شروع کر رکھا تھا۔ اس دن میں نے
تھا تو تم انجان سا بن کر کہہ گئے تھے کہ مجھے خبر نہیں کون پھینکتا ہے سامان۔" "اب
تو توقیر صاحب جھوٹ بھی کہتے ہیں۔"

کنول نے ہنس کے کہا۔

"اب انھیں زیادہ شرمندہ نہ کیجیے امی! بچارے آج خوب پکڑے گئے ہیں۔"

"اب اس طرح چپ بیٹھے ہیں جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔"

توقیر نے سر جھکا کر مسکرا کے کہا۔

"کہہ لو جو کہنا ہے موقع ملا ہے آج تمہیں؟"

کنول باہر چل دی۔

"امی میں سامان اٹھا لاؤں جو انہوں نے پھینکا ہے"

توقیر بھی کھڑا ہو گیا۔

"کہاں چلے ہو بیٹا! جمیلہ نے پوچھا۔

"کنول کے ساتھ سامان اٹھا لاؤں ماں جی!"

دونوں ایک ساتھ باہر آئے۔ کنول سامان دیکھنے لگی۔

آٹے کی ایک تھیلی۔

گھی کا ڈبہ

چائے کا پیکٹ

چینی کی تھیلی

اور ایک گتے کا پیکٹ

کنول نے تیز نگاہوں سے توقیر کی طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

توقیر نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ساڑھی اور بلوز"

"اچھا" کنول نے ڈبے کو کھول ڈالا۔

"رنگ تو دونوں کا بڑا اچھا میچ کر رہا ہے۔ کس کے لیے خریدے ہیں یہ" انجان بن سے کنول نے پوچھا۔

"توقیر نے بھی بے پروائی سے کہا۔

"ایک لڑکی کے لیے"

کنول کی نگاہوں میں شوخی آ گئی۔

"کیا نام ہے اس کا؟"

"کنول۔ شفاف پانی کی جھیل کا خوبصورت کنول!"

کنول نے اسے گھورا۔

"بہت شریر ہوتے جا رہے ہیں آپ۔"

"امی کو یہ پیکٹ نہ دکھانا۔"

"کیوں۔ اتنا ہی ڈر تھا تو لینا ہی نہیں تھا۔"

"اچھا بحث نہ کرو۔ سامان اٹھا کر چلیں۔ میں نے جانا بھی ہے دیر ہو رہی ہے"

"کہاں جانا ہے؟"

"گھر اور کہاں۔"

"رات یہیں رہنا ہو گا۔"

"آج نہیں۔ کل کا وعدہ ہے۔"

کنول بے تکلف ہو گئی۔

"آج اگر آپ رات نہ رہے تو میں نہیں لوں گی آپ سے۔"

توقیر کے لہجہ میں بھی شرارت آگئی۔

"کس سے بولو گی پھر؟"

کنول نے شوخی سے کہا

"میری ایک جان ہے اِس سے بولونگی"

"کیا نام ہے اس کا؟ توقیر نے مسکرا کے پوچھا۔

کنول ہنس دی۔

اس کا نام —— اس کا نام ہے توقیر

دونوں کھِلکھلا کر ہنس پڑے اور سامان اٹھا کر اندر لے آئے۔ کنول گھی کا ڈبہ کمرے کے کونے میں رکھتے ہوئے بولی۔ اتنا ڈھیر سا سامان آج پھینکا ہے امی! میرے لیے کپڑے بھی لائے ہیں یہ۔ کنول نے ساڑھی اور بلوز جمیلہ کے سامنے رکھ دیے۔

جمیلہ نے پیار میں ڈانٹا۔

"بہت فضول خرچ ہو رہے ہو توقیر تم"

"کوئی فضول خرچی نہیں ماں جی! سب گھریلو استعمال کی چیزیں ہیں"

"امی کھانا لاؤں" کنول نے پوچھا۔

"لے آؤ۔ توقیر کے ہاتھ بھی یہیں دھلا دو"

"میں خود دھولیتا ہوں ماں جی!" توقیر اٹھا اور نل پر چلا گیا۔

تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ بعد میں چائے پی۔ اور کنول اپنے کمرے سے توقیر

لیے بنائی ہوئی جرسی اُٹھا لائی۔

"اسے ذرا پہن کر دکھائیے"

ہاں ہاں پہنو تو سہی بیٹا! دیکھوں کیسی لگتی ہے تمہیں۔ جمیلہ نے کہا

توقیر نے پہن لی۔

"خدا بچائے چشم بد سے" جمیلہ نے مسکرا کے کہا۔

کنول اِدھر اُدھر سے جرسی کھینچ کر دیکھنے لگی۔

"بالکل ٹھیک ہے"

توقیر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"شکریہ"

کنول نے جمیلہ کے کمرے میں ہی دو بستر اور لگا دیے۔ ایک توقیر اور دوسرا اپنے لیے رات کافی گزر چکی تھی جمیلہ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

"کنول! اپنے ابا کا کوئی سلیپنگ سوٹ نکال دو توقیر کو۔ جاؤ بیٹا! لباس بدلو اور آرام کرو"

اس نے توقیر سے کہا۔

کنول کے پیچھے جب توقیر دوسرے کمرے میں گیا تو ہلکے سے کہا۔

"کیا مصیبت ہے۔ کل میں آتا اور اپنا رات کا لباس لے آتا"

کنول خفا ہو گئی۔

"اتنے ہی تنگ ہیں آپ تو جائیے چلے جائیے"

"چلا جاؤں؟"

کنول نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"جائیے"

"چھوڑو پھر مجھے"

"میں نے اپنی جان کو پکڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی یہاں ہے تو بیشک جائیے"

دونوں ہنس دیے۔

کیا کرنا ہے آپ نے سیلپنگ سوٹ" کنول نے کہا۔

"کیوں؟"

"میری ساڑھی اور بلوز پہن کے سو رہیئے"

ایک بار پھر دونوں زور سے ہنس پڑے

دوسرے دن صبح ہی صبح کنول نے توقیر کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا

"اٹھیئے"

توقیر اینٹھا پڑا سوتا رہا" سونے دو کنول! وہ بڑبڑایا۔

کنول نے پھر اس کا شانہ ہلایا۔

"اچھا تو آپ کو یہ عادت بھی ہے۔ میں نے کہا راجو صاحب جلدی اُٹھیئے۔ مجھے رہی ہے" کالج سے توقیر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کنول پاس کھڑی مسکرا رہی تھی۔ بالکل اس طرح جیسے صبح ہی صبح شبنم میں نہ کوئی تروتازہ پھول مسکرا رہا ہو۔

"اُٹھ کر نہا لیجیئے"

توقیر غسل خانے میں چل دیا۔

دونوں نے جمیلہ کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ توقیر نے لباس تبدیل کیا۔ اتنی دیر تک کنول بھی کالج کا ڈریس پہن چکی تھی۔ دونوں باہر سڑک پر آئے اور بس سے لارنس چوک پہنچے۔ کنول کالج چلی گئی۔ اور توقیر مچھلی مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔

توقیر سے اس دن کی ملاقات نے برجیس کو ایک عجیب طرح کی کشاکش [illegible]
رکھا تھا۔ لاکھ اس نے دھواں دھواں سے اس ماحول سے نکلنا چاہا۔ پر ذہن [illegible]
سوچوں کا تمدر بڑھتا ہی چلا گیا۔ اکثر وہ الجھ سی جاتی۔ اس کا دل توقیر کو راجو ماننے
بالکل تیار نہ ہو رہا تھا۔ اس نئے روپ میں اسے توقیر سے ہمدردی ہوتی جارہی [illegible]
وہ پہروں بیٹھی سوچتی رہتی۔
مدنما سے خیال پھیل پھیل جاتے۔
ذہن کے گرد پھیلی ہوئی غبار میں کبھی حسرت اور ناامیدی کی تپش گہری [illegible]
وہ چھٹکارا چاہتی۔ لیکن توقیر زندگی کے سٹیج پر ایک نیا روپ دکھا کر اس [illegible]

اور ارادوں میں کچھ اور ہی طرح کی دل پسند سی راہ پیدا کر گیا تھا۔
دالان میں کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے پڑھتے آج وہ پھر الجھ سی گئی۔ سردی کی کمر
اب ٹوٹ چکی تھی۔ اور دھوپ کی تیزی بڑھ گئی تھی۔ دن بھی کافی چڑھ آیا تھا۔ برجیس
اُٹھ کر اندر آئی۔ پیازی رنگ کی ایک قیمتی ساڑھی پہنی۔ چہرہ کو ہلکا سا لیپ کیا کچھ سوچ
کر باہر آئی اور کار نکال کر بازار کی طرف چلی گئی
سہ پہر تک وہ یونہی غیر ضروری چیزوں کی شاپنگ کرتی رہی۔ سکون کی تلاش میں
اِدھر اُدھر بھٹکتی رہی بیچاری۔ آخر گھر لوٹ آئی اور اُردو کا رسالہ اٹھا کر کوئی افسانہ پڑھنے
لگی پر سکون پھر بھی نہ ملا۔
گھبرا کر وہ پھر کار میں باہر نکل گئی۔ اور سیدھی مچھلی مارکیٹ میں داخل ہوئی۔ چند
مچھیرے مچھلی لگائے بیٹھے تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا نہ توقیر تھا نہ ہی غیاث آخر اس
نے قریب بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے مچھیرے سے پوچھا۔
"بابا! ادھر ایک مچھیرا بیٹھتا تھا کدھر گیا وہ"
کیف و نزار بوڑھے نے مدھم سی آواز میں پوچھا۔
"کون بٹیا؟"
"وہ جوان سا لڑکا جو یہاں مچھلیاں لگاتا ہے"
"وہ راجو؟"
"ہاں ہاں وہی"
"وہ تو بٹیا دوپہر ہی کو مچھلیاں بیچ کر چلا جاتا ہے۔ اِس وقت تک وہ یہاں نہیں

رہتا۔ بڑا تیز چھورا ہے بیٹا آندھی کی طرح کام کرتا ہے ..... پوری منڈی کا تیز مچھیرا ہے
پڑھا لکھا بھی ہے پر ہے بڑا جیالا اور دل آور"

برجیس نے پھر پوچھا۔ بابا اس وقت وہ کہاں ملے گا۔

اس وقت دریا کنارے ہوگا۔ کوئی جروری کام ہو تو وہیں مل لیں نہیں تو صبح ملیں
روزانہ ہمیں مچھلیاں لگاتا ہے"

برجیس وہاں سے نکل کر دریا کنارے آئی۔ کافی دیر تک وہ بڑی بیتابی سے کنارے
کنارے دیکھتی رہی مگر کہیں توقیر دکھائی نہ دیا۔ دریا میں ادھر ادھر ماہی گیروں کی چند کشتیاں
تیر رہی تھیں لیکن توقیر ان میں نہیں تھا۔

وہ جب واپس مڑی تو اس کی نظر اتفاقاً بائیں طرف اٹھ گئی۔ ایک بڑے سے
جوہڑ میں تین مچھیرے مچھلیاں پکڑ رہے تھے برجیس تیزی سے اس سمت بڑھی۔ جب
وہ قریب گئی تو اس نے دیکھا لکڑی کے تختے جن پر دھیان کا پھوس رکھا ہوا تھا۔ توقیر
غیاث اور مسعود ان پر کھڑے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔

برجیس جوہڑ کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر تک وہ مچھلیاں پکڑ پکڑ کر
اپنے اپنے مچھیڑوں میں ڈالتے رہے۔ برجیس بیٹھی انہیں غور سے دیکھتی رہی۔ توقیر
اسے کنارے پر بیٹھے دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس نے کوئی اثر ہی نہ لیا۔

شام سے کچھ پہلے تینوں نے اپنے جال سمیٹ لیے۔ غیاث ہاتھوں سے چپوں کا
کام لیتا ہوا اپنی مچھلیاں پکڑنے کی مچان کنارے کی طرف لایا۔ اپنی مچھلیاں اٹھا
وہ برجیس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ توقیر اور مسعود بھی اس کے پیچھے پیچھے کنارے پر

گئے غیاث نے آگے بڑھ کر برجیس سے پوچھا۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو بیٹا!"

برجیس کھڑی ہو گئی۔

"مچھلی چاہیئے بابا!"

ہمارے پاس یہاں تو کوئی باٹ اور تول کا سامان ہی نہیں۔ یہ تو ہم مارکیٹ جا
ہی بیچتے ہیں۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم اس دن بھی راجو سے ڈھیر سی مچھلیاں
لے گئی تھیں۔ دو چار کی ضرورت ہو تو ویسے ہی لے لو بیٹا!"

توقیر اور مسعود ابھی تک ایک طرف ہٹ کر کھڑے تھے۔

برجیس چند قدم آگے بڑھی۔

"میں ساری ہی خرید لوں گی بابا!"

غیاث نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"ساری لے لو گی تم۔ ہم تینوں کی؟"

"ہاں تینوں کی مچھلیاں خرید لوں گی۔ بولو کیا لو گے؟"

غیاث چلانے لگا۔

"ابے او راجو مسعود ادھر آؤ ادھر۔ جلدی کرو جلدی۔ ارے دیکھو کیا کر رہے ہو
وہاں تو آؤ۔ ہماری ساری مچھلیاں یہیں بک گئی ہیں۔ دیکھو تو یہ بیٹا ہماری ساری
مچھلیاں خریدے گی۔"

توقیر اور مسعود قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ توقیر نے انجان بن کے پوچھا۔

"کیا بات ہے ماموں!"

"ارے راجو! ہماری ساری مچھلیاں اِس بیٹا نے خرید لیں۔"

"چلو اچھا ہو گیا۔" توقیر نے کہا۔

برجیس پھر بولی

"بابا! یہ ساری مچھلی اپنی گدھا گاڑی سے میرے ہاں پہنچا دو۔ وہیں چل کے قیمت دے دوں گی جلدی کرو ذرا دیر ہو رہی ہے۔"

تینوں نے اپنی اپنی مچھلیاں گدھا گاڑی میں رکھیں۔ غیاث نے جلدی جلد جوت دیا اور برجیس سے کہا۔

بیٹھو بٹیا اپنی کار میں۔

برجیس نے توقیر کی طرف دیکھ کے کہا۔

"آپ دونوں آئیے بیٹھ جائیے کار میں۔"

غیاث نے خوش ہو کے کہا۔

"بیٹھ بیٹھ جاؤ تم دونوں۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے گاڑی چلاتا ہوں۔"

توقیر گدھا گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"اپنی گاڑی ہی اچھی ہے ماموں۔ کِسی کا شرمندۂ احسان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم نے تو ہر روز اِسی میں آنا جانا ہے۔"

مسعود بھی اس کے ساتھ ہو بیٹھا۔

برجیس شرمندہ سی ہو کر کار میں بیٹھ گئی۔

غیاث نے ذرا زور سے کہا۔

بُرا نہ ماننا بیٹا! یہ چھوکرا بڑا چھلبلیا ہے۔ بات کرتے سوچتا نہیں۔ بس اچانک پھٹ پڑتا ہے۔ لاکھ سمجھاؤں اِسے پر کب باج آوے ہے۔"

برجیس نے آہستگی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

تینوں برجیس کے ہاں پہنچے۔ ساری مچھلی دالان میں رکھ دی گئی۔ توقیر غیاث اور مسعود کو برجیس نے ڈرائنگ روم میں بٹھا پڑا۔ غیاث کو بھی برجیس نے بڑی مشکل سے بیٹھنے پر مجبور کیا تھا۔

برجیس کے کہنے پر کریمن بوا نے ساری مچھلی محلے والوں میں بانٹ دی محلے کی عورتیں تھوڑی ہی دیر میں ساری مچھلی اٹھا کر لے گئیں۔ برجیس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کریمن ہیٹر پر چائے کے لیے پانی رکھ کر اس کے کمرے میں آئی وہ۔

وہ اِس وقت عجیب کشمکش میں تھی۔

توقیر سے متعلق برجیس سے وہ بہت کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی۔

توقیر نے اِسے بھی شش و پنج میں ڈال رکھا تھا۔ جب بھی اس نے سوچا برجیس سے کچھ پوچھے عجیب طرح کے وسوسے اُسے خاموش کر دیتے۔ لیکن آج وہ کچھ کہنے پر تُل ہی گئی تھی۔ برجیس صوفے پر گری پڑی تھی۔

کریمن بُوا نے آہستگی سے پُوچھا۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے بٹیّا۔"

برجیس سنبھل گئی۔

"ٹھیک ہوں بُوا۔"

"وہ مچھیرا آج پھر آیا ہوا ہے بیٹی! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا اس کا
کیسے ہے۔ دیکھو نا بیٹی۔"

"کیا نام تھا اپنے ——— ہاں!"———

بالکل۔

اپنے توقیر جیسا ہے۔

وہی شکل و شمائل

ویسا ہی بھرا بھرا کسرتی بدن۔

وہی رفتار وہی گفتار

ہاں کپڑوں کا فرق ہے صرف۔ انھوں نے کبھی ایسا لباس نہ پہنا تھا
سے کھل کر ذرا بات تو کرو۔ بیٹی۔ ہو سکتا ہے یہ ان کا کوئی رشتہ دار ہو اور ا
ان کا کوئی پتہ ہی مل جائے۔

برجیس آج کریمن کے سامنے پھٹ ہی پڑی۔

اصل بات یہ ہے بُوا۔ میں نے بھائی جان کو اپنی شادی توقیر سے کر
کہا تھا۔ وہ ان دنوں بی۔ اے میں پڑھتا تھا اور کسی غریب گھرانے کا
نے خود اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تصویریں بناتا تھا اور میں اس کی تص
کی وجہ سے اس سے اس کی طرف مائل ہو گئی تھی۔ لیکن بھائی جان نے

بس اللہ ہی توقیر سے کر دی۔ یہ کسی بہت بڑے جاگیردار کا لڑکا ہے۔ وہ ہماری بوڑھی
ملازمہ ساجدہ اسے جانتی تھی۔ لیکن حیرت تو یہ ہے ساجدہ بھی اس دن کے بعد نہیں
لوٹی۔ نہ ہی مجھے اس کے گھر کا اتہ پتہ یاد ہے جو میں اس سے ہی توقیر کا پتہ کرتی۔"

کریمن نے ذرا جستجو سے کریدا

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی بیٹی!"

برجیس نے دکھ سے کہا۔

"کونسی؟"

آپ دونوں کی ناراضگی کیا ہوئی۔ جو وہ یوں روپوش ہو گئے ہیں"

بات تو یہ ہے بُوا کہ میں اسے پہلے سے ہی ناپسند کرتی تھی اور یہ بات میں نے
پہلے ہی دن اسے کہہ دی تھی۔ میں اسی وقت بھائی جان سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن
توقیر نے کہا تھا کہ میری ماں بیمار ہے صرف ایک ماہ خاموش رہو اس کے بعد میں تمہیں
طلاق دے دوں گا۔ کراچی سے واپسی پر وہ سیدھے اپنے گھر چلے گئے اس کے بعد وہ
واپس ہی نہیں آئے نہ ہی اپنے متعلق کوئی اطلاع دی ہے۔ طلاق کا وعدہ کیا تھا وہ بھی
نہیں بھیجی۔"

کریمن حیرت زدہ ہو گئی۔

اب پوری بات آئی میری سمجھ میں۔ میں بھی ہر وقت سوچتی رہتی تھی کہ وجہ کیا
ہے جو وہ یوں بغیر کوئی اطلاع دیے ...... ہی روپوش ہو گئے ہیں۔

برجیس نے حسرت بھرے لہجہ میں پوچھا۔

"اب بتاؤ کیا کرنا چاہیئے بُوا؟"

کریمن نے سوچ کے کہا۔

"اس سے بات نہ کریں ذرا؟"

"کس سے؟"

"اسی مچھیرے سے کیا نام بتایا تھا اس دن اس نے ــــ بھلا سا ہے یاد نہیں پڑ رہا"

راجو!

"ہاں ہاں۔"

"کیا بات کرو گی؟"

یہی کہ ہو سکتا ہے توقیر بچارہ کوئی غریب لڑکا ہی ہو اور آپ سے ناراضگی کی وجہ سے اس نے راجو کا روپ دھار کر بالکل ہی بیگانگی اختیار کر لی ہو"

برجیس اُداس ہو گئی

اگر یہ بات ہوئی تو میں وعدہ کرتی ہوں بُوا میں ان سے اپنی غلطی کی معافی مانگ کر نئی زندگی کا آغاز کروں گی۔ مجھے صرف نفرت تھی تو ایسی بات کی کہ میرا شوہر ایک امیر اور مغرور جوان ہے۔ غریبوں سے مجھے محبت ہے۔ بُوا ایسی محبت جس پر میں سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔ توقیر اگر واقعی کوئی غریب لڑکا ہے تو میں اپنی نفرت محبت میں بدل دوں گی اور

اور ثابت کر دوں گی کہ ایک مشرقی بیوی شوہر کی خاطر بہت بڑی قربانی دے سکتی ہے

کریمن نے جھٹ کہا۔

"میں پھر اسے یہیں بُلا کر پُوچھتی ہوں"

برجیس کہیں دور سے بولی۔

"ٹھیک ہے بُلا لو یہیں"

کریمن باہر نکل گئی۔

برجیس بیتابی سے انتظار کرنے لگی۔ توقیر کے ساتھ اس کی نفرت اب ہمدردی کی حدوں کو پھلانگتی ہوئی محبت اور چاہت کی وادیوں میں بھٹکنے لگی تھی۔ اس نے لاکھ ایک توقیر کی خاطر دوسرے توقیر کی خاطر دوسرے توقیر سے نفرت کرنا چاہی۔ لیکن توقیر جو حقیقت میں ایک ہی تھا اب نئے روپ میں اس کے سامنے آ کر اسے ایک نئی ہی راہ پر چلنے کے لیے مجبور کر گیا تھا۔

توقیر کے انتظار میں اس کی حالت اف اب غیر ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے دل میں ایک نئی اُمنگ اُٹھ رہی تھی۔

ایسی اُمنگ جو صرف محبت کے جذبہ میں ڈوب کر ہی پیدا ہوتی ہے

وُہ اپنے آپ کو توقیر کا سامنا کرنے کے لیے تیار نہ پا رہی تھی۔"

باہر قدموں کی چاپ سُنائی دی۔

برجیس سنبھل کر بیٹھ گئی۔ اس کے بدن میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ تاہم چہرے پر بشاشت لاتی ہوئی وہ سنبھل ہی گئی۔

کریمن بُوا کے پیچھے پیچھے توقیر اندر آیا اور بڑی شائستگی سے پُوچھا۔

”مجھے یاد کیا آپ نے ؟“

برجیس کے بدن میں تلذذ آمیز لہریں پھیل گئیں ۔

”بیٹھے“، بڑی مشکل سے برجیس نے کہا۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اب کریمن بُوا نے پُوچھا۔

”ایک بات تم سے پُوچھنی ہے بیٹا۔ جھوٹ تو نہ بولو گے ؟“

توقیر سنبھل گیا ۔

”آپ پوچھیں تو سچ کہوں گا میں ؟“

”تمہارا صحیح نام کیا ہے ؟“

”اس دن تو بتایا تھا میرا نام راجو ہے۔ لیکن مارکیٹ میں زیادہ لوگ مجھے را
ہی کہتے ہیں ؟“

”اس کے علاوہ بھی کوئی نام ہے ؟“

”نہیں تو۔ ماں باپ نے یہی رکھا تھا“

”شادی کی ہوئی ہے ؟“

”ابھی نہیں۔ منگنی ہے صرف“

”کس سے“

”وہیں اپنی بستی میں مچھیرے کی ایک لڑکی سے ؟“

کریمن مایوس نظر آنے لگی۔

”برجیس کا دل بھی بیٹھ گیا۔ کسی قدر ہکارتے ہوئے اس نے کہا۔

”چائے ہی لے آؤ بُوا“

کریمن باہر نکل گئی ۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی پھیکی پھیکی سی۔ برجیس بچاری خبر نہیں کن سوچوں میں
اُلجھی گئی تھی۔ توقیر سب کچھ جانتے ہوئے بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔ آخر برجیس ہی
بولی۔

”آپ یہ کام کیوں کرتے ہیں ؟“

توقیر نے مصنوعی انداز میں چونک کے کہا۔

”اَن پڑھ ہو کر اس کے علاوہ کیا کر سکتا ہوں ۔ دوسرے یہ میرا خاندانی پیشہ جو
ہوا“

”میں آج مارکیٹ گئی تھی وہاں ایک بوڑھا کہہ رہا تھا آپ پڑھے لکھے ہیں ؟“

آٹھ تک پڑھا ہوا ہوں۔ ایسا آدمی پڑھے لکھوں کی طرح ہے۔ مچھیروں جیسا نہیں
میں زیادہ عرصہ شہر سے باہر اپنے ایک ماموں کے ہاں رہا ہوں۔ اس لیے میرا
انداز ان عام مچھیروں جیسا نہیں ہے ؟“

کریمن بوا چائے لے آئی ۔

توقیر کھڑا ہو گیا۔

”میں اب چلتا ہوں ؟“

کریمن نے اس کا بازو پکڑ کر بٹھایا۔

"بیٹھو بیٹا! تم یہیں پی لو چائے۔ تمہارے ساتھیوں کو میں چائے دے آ
ہوں۔"

برجیس اور توقیر چائے پینے لگے۔ کریمن بوا ان کے پاس ہی کھڑی رہی۔ غیا
اور مسعود چائے پی کر باہر نکل آئے۔ توقیر نے انہیں دیکھ کر جلدی جلدی چائے پی او
چلا گیا۔ برجیس بھی باہر آئی اور غیاث کو آواز دیتے ہوئے کہا۔

"بابا! آپ ذرا ٹھہرنا"

غیاث وہیں کھڑا ہو گیا۔

توقیر گدھا گاڑی کے قریب مسعود کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ مسعود اُسے دیک
ہی مسکرا پڑا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ توقیر نے اُسے ٹھوکا لگا
ہوتے پوچھا۔

"کیا بات ہے بڑے مسکرا رہے ہو۔"

شوخی سے مسعود سے کہا۔

"ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"یہ لونڈیا تمہیں چاہنے لگی ہے۔"

"بکواس نہ کرو۔"

"یہ کوئی بڑی بات ہے۔ مچھلیاں خریدنے کا تو ایک بہانہ ہے۔ وہ صرف تمہیں
دیکھنا چاہتی ہے۔ بھئی تم جیسے خوبصورت لڑکوں کو یہی تو ایک فائدہ ہے امیر سے امیر

لڑکیاں بھی تم پر مر سکتی ہیں۔ ایک ہم ہیں جو کھنا سے منہ والے جنھیں کوئی پوچھتا ہی نہیں
بہر حال تمہیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔"

توقیر نے خشگی سے کہا۔

"بکتے ہی جاؤ گے یا رکو گے بھی۔"

"تمہیں اس نے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ کیا کہتی تھی۔"

"چائے پلائی تھی بس۔"

"ہاں بھائی ہم سے تو علیحدہ ہی پلانا تھا نا۔ دلبر جو ٹھہرے۔"

توقیر خاموش ہو رہا۔ سامنے غیاث مسکراتا ہوا آ رہا تھا۔ ان دونوں کے پاس پہنچ
کر غیاث نے خوشی ملے جُلے جذبات میں کہا۔

"دیکھو راجو اس بٹیا نے سو روپیہ دیا ہے۔"

"کاہے کا۔"

"مچھلی کا اور کس کا۔"

"ہم نہیں لیں گے ماموں! نو روپے کی میری اور نو ہی کی مسعود کی تھی۔ تم اپنی گیارہ کی
کرلو۔ ایک روپیہ گاڑی کا کرایہ ملا کر کل تیس روپے لے لو۔ ہم دونوں کو نو نو دے دو باقی تم
رکھنا چاہتے ہو تو رکھ لو۔ ہم حرام نہیں کھاتے جتنی محنت کی ہے اسی قدر لیں گے۔"

مسعود بھی بول پڑا۔

توقیر ٹھیک کہتا ہے ماموں باتیں رکھ لو دوسرے پھیر دو۔

اتنی دیر تک برجیس بھی وہیں پہنچ گئی۔

"کیا بات ہے آتے ہی اس نے پوچھا" جھگڑا ہو رہا ہے کیا"

غیاث نے ستر روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔

"یہ لو بیٹا ہم نے تیس روپے رکھ لیے۔ یہ نہیں لیتا سارے"

"کون نہیں لیتا۔ برجیس نے پوچھا۔

غیاث نے نوٹ زبردستی اسے تھما دیے

"راجو"

"کیوں نہیں لیتا؟"

غیاث گاڑی میں بیٹھ گیا۔

یہ بڑا اَنٹ کھنٹ چھوڑا ہے بیٹا۔ بات تو کسی کی مانتے ہی ناں۔ اچھا ہم اب جاتے ہیں شام ہو گئی ہے" غیاث نے گدھا ہانگ دیا۔

برجیس گیٹ پر کھڑی ہو کر تینوں کو جاتے دیکھتی رہی۔ جب وہ سامنے سڑک شام کی پھیلتی سیاہی میں غائب ہو گئے۔ تو وہ اُداس ہو گئی۔ اس کے دل میں ہوک اٹھی۔

ایسی ہوک، جو صاف الفاظ میں کہہ گئی ہو تُو ـــ تُو تُو ـــ توقیر کو بھول کر سے پیار کرنے لگی ہے۔ ہا ہا ہا ہا

اندھیرا پھیل گیا تھا۔

گھُپ اندھیرا

چور اچکوں کا دوست اور اشراف کا دشمن

ہواؤں سرسراہٹ اور شبنمی قطروں کی پھسلن پر تاریک رات پھسلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ توقیر اپنے کمرے میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اس کے سامنے ساجدہ بیٹھی اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ جن میں ممتا کا نُور تھا۔

ممتا، جس کی تیز کرنیں پتھر دل میں بھی پار ہو جاتی ہے۔

توقیر نے کھانا کھا لیا تو ساجدہ نے برتن سمیٹے اور دوبارہ اس کے سامنے ہی آ

کر بیٹھ گئی۔ وہ کسی بات کی ابتدا کرنا چاہ رہی تھی لیکن شاید ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ یا الفاظ
اس کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔

توقیر خود ہی بول پڑا۔

"منزہ اور شہناز کہاں ہیں ماں"

"یہیں بیٹھی تھیں بیٹا! ابھی ابھی اُٹھ کے گئی ہیں۔ پڑھ رہی ہوں گی شاید"

توقیر چپ ہو گیا۔

ساجدہ گہری آواز میں بولی۔

"توقیر!"

"جی امی جان!"

گھر میں ایک ایسا مسئلہ آن اُبھرا ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ بہت دنوں
سے تم سے بات کرنا چاہتی تھی لیکن تمہاری پریشانیوں میں اضافہ کرنے کو جی نہیں چاہتا
سوچ رہی تھی خود ہی کوئی حل نکل آئے گا۔ لیکن بات اب آخری حدود کو جا پہنچی ہے"

توقیر پریشان ہو گیا۔

"بات کیا ہے امی! ذرا کھُل کے کہیئے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں بیٹھا"

بتاتی ہوں بیٹا! اس مسئلے کو صرف تم ہی نمٹا سکتے ہو۔ لیکن وعدہ کرو کہ کسی سے جھگڑا
نہیں کرو گے تم۔ مَیں نہیں چاہتی گھر میں جھگڑا فساد ہو"

توقیر نے ماں کی ڈھارس بندھائی۔

"آج تک میں نے کسی سے جھگڑا کیا ہے امی! جو اب فضول جھگڑے پڑوں گا کسی سے"

"اپنی منزہ ہے نا بیٹا!"

"ہاں ہاں کیا ہوا اسے؟"

"سمجھ نہیں آ رہی بات کیسے شروع کروں"

"امی! زیادہ پریشان نہ کیجیئے اب بتا بھی چکیئے نا"

ساجدہ بول ہی پڑی۔

وحید اور فریدہ اپنی منزہ کی شادی زاہد سے کرنا چاہتے ہیں"

توقیر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"کیوں؟"

بس اُن کی مرضی"

"زبردستی ہی"

"بالکل وہ چاہتے ہی ایسا ہیں"

"آپ سے انہوں نے بات کی ہے اس بارے میں"

ہاں۔ میں نے اُن کو سمجھایا بھی کہ منزہ تمہارے ماموں صابر کے لڑکے انجم کی منگیتر
لیکن وہ دونوں میاں بیوی کہتے ہیں منگنی ہی ہوئی ہے نا شادی تو نہیں ہوئی اور منگنی
ٹ سکتی ہے۔ زاہد نے کہیں وحید اور فریدہ کے سامنے منزہ سے اپنی دلچسپی کا اظہار
کر دیا ہے اسی لیے تو وہ ڈاکٹری کر چکنے کے باوجود یہاں رُکا ہوا ہے"

توقیر نے ماں کو تسلی دی۔

"آپ فکر نہ کریں امی! منزہ کی شادی انجم سے ہی ہوگی۔ بیاہ شادی کے معاملے

میں کوئی زبردستی نہیں کرسکتا" "وہ تو بیٹا ایک دو دن تک شادی کرنے پر تلے ہو

" منزہ کی مرضی ہے یا یوں ہی "

" وحید کہہ رہا تھا منزہ مان گئی تو ٹھیک۔ ورنہ زبردستی بھی ہوسکتی ہے" ا

میاں بیوی کی نظر منزہ کی جائداد پر ہے "

توقیر طیش میں آگیا۔

" عورت کوئی جانور نہیں امی! جو آنکھیں بند کرکے کسی کے پلے باندھ دی جا
بیاہ کے معاملے میں تو ہمارا مذہب بھی اسے منہ کھولنے کی پوری آزادی بخشتا
ہوگا ہی جو منزہ چاہتی ہے۔ ہوگا وہی جو منزہ چاہتی ہے۔ اس نے اگر زاہد
کے لیے رضامندی ظاہر کردی تو میں خاموش ہوجاؤں گا۔ اور اگر اس نے انکار
بھابی کے ارادوں میں دیوار بن جاؤں گا۔ زبردستی شادی میں کسی صورت میں نہ
دوں گا"

" سوچ لو بیٹا "

سوچنا کیا ہے امی! بھابی نے آج تک مجھے ہنستے کھیلتے اور چپ چاپ
اس نے اگر اس معاملہ میں زبردستی کی تو میں اس کے لیے ایک وحشی اور خونی
کا روپ بھی دھار سکتا ہوں۔ منزہ میری بہن ہے اور بہن بھائیوں کی عزت
اور عزت دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہے۔ اب میں زاہد کے بچے کو اس گھر
کے ہی دم لوں گا"

" یہ فریدہ تو بیٹا ہر وقت منزہ کے پاس ہی بیٹھی رہتی ہے۔ جانے کیا

ہی ہے" اسے توقیر نے غصے میں کہا۔

" بڑی لتری کان کتری عورت ہے یہ "

ساجدہ نے بھی تائید کی۔

ہاں تو اور کیا۔ کوے اڑاتی ہے پوری۔ آدمی کو درخت کی پھننگ پر بٹھا کر نیچے سے
درخت ہلانے والی عورت ہے یہ۔ جب سے اس گھر میں آئی ہے کوئی کام سیدھا نہیں
یا اس نے۔ بہو کیا بی چڑیل آگئی ہے... کھانا تو اکثر میں خود ہی پکاتی ہوں جس دن
یہ خود پکائے ہم تینوں ماں بیٹے اور بیٹی کے لیے تو ایسا پکاتی ہے جیسے موٹے کتوں کا
ات ہو۔ لیکن خاموش ہو رہتی ہوں۔ دن جو کاٹنے ہوئے عزت سے "

" میں ایک کام نہ کروں امی "

" کیا؟ "

" ماموں جان کو ابھی جا کے فون کردیتا ہوں "

" کیا کہو گے؟ "

" بھابی کے سب ارادے انہیں بتا دوں گا۔ اور کہوں گا کہ کل انجم کو ساتھ لے کر آئیں
اور دونوں باپ بیٹا منزہ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ کیا خیال ہے آپ کا "

" یہ اچھا طریقہ ہے بیٹا۔ اس طرح تو نہ رہے بانس نہ بجے گی بانسری۔ تم ابھی جاکر
فون کر آؤ "

" پہلے امی! منزہ سے پوچھنا چاہیے "

ہاں اس کا عندیہ لینا بھی ضروری۔ میں اسے بلاؤں نا "

"کہاں ہے وہ؟"

"اِدھر شہناز کے پاس بیٹھی ہے۔"

"آپ جائیے نا ذرا اسے میرے پاس بھیج دیجیے۔ شہناز کے پاس بیٹھی رہ
وہ اِدھر نہ آئے۔ بھابی بھائی اور زاہد پر بھی نظر رکھے گا۔ کہیں وہ ہماری بات
سُن لیں۔"

ساجدہ اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

کچھ ہی دیر بعد منزہ اندر آئی۔ توقیر کو غصے کی حالت میں دیکھ کر وہ کانپ گئی۔

توقیر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"بیٹھو زہرا!"

منزہ ہ پتی ہوئی بیٹھ گئی۔

توقیر کچھ دیر خاموش رہا۔ بات کی ابتدا کرنے کے لئے شاید مناسب الف
تھا۔ لیکن منزہ نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔ کانپتی ہوئی آواز میں ا
"بھائی جان! مجھ سے کوئی غلطی ہوئی۔ میری کسی حرکت سے اگر آپ ناراض
تو یہ میرے لیے سب سے بڑی بدنصیبی ہوگی۔

توقیر نے اس کی ہمت بندھائی۔

نہیں کوئی بات نہیں زلی۔"

"میں تو آپ کی حالت دیکھ کر کانپ ہی گئی تھی۔"

اچانک توقیر نے منزہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"زلی! یہ کس کا ہاتھ ہے؟"

منزہ نے سوچ کے کہا۔

ایک بھائی کا جسے میں اپنے باپ کا سایہ بھی سمجھتی ہوں۔"

توقیر نے منزہ کے گال پر پیاری سی چپت لگائی۔

"بہت عقلمند ہے ہماری بہن۔"

"توقیر ذرا سا رُکا۔

ایک بات پوچھوں گا زلی۔ سچ سچ کہنا۔

آپ بیشک پوچھیں ایک بہن اپنے بھائی کے سامنے جھوٹ بولنے کی ضرورت
ں نہیں کرے گی۔"

شاباش یہی اُمید تھی مجھے۔"

پُوچھوں؟"

"پُوچھیں۔"

تمہیں پتہ ہے نا تمہاری منگنی انجم سے طے ہے؟"

"جی۔"

تم اس میں کوئی تبدیلی چاہتی ہو؟"

منزہ نے عزم کے ساتھ کہا۔

"اپنی زندگی میں تو اس میں کوئی تبدیلی نہ ہونے دوں گی بھائی جان موت کے بعد

"سو ہو۔"

"میرا خیال بھی یہی تھا۔ بھابی کے ارادوں سے تو تم واقف ہی ہو نا"

منزہ نے دُکھ سے کہا۔

میرے ساتھ بھی وہ الٹی سیدھی باتیں کرتی رہتی ہیں بھائی جان! لیکن میں اُن

لیتی ہوں کوئی اثر نہیں لیتی۔ کبھی کبھی خیال تو آتا ہے کوئی مناسب جواب اُن کے مُ

دے ماروں۔ لیکن خدا گواہ ہے۔ میں خالہ اور آپ کا خیال کر کے چُپ ہو رہی

"یہ تو تمہاری نوازش ہے زلی جو ہمیں اِس قابل سمجھتی ہو"

"سچی بات تو یہ ہے بھائی جان! میں اِس گھر میں صرف آپ، خالہ اور شہن

وجہ سے رہ رہی ہوں ورنہ کسی شریف اور جوان لڑکی کے رہنے کو یہ جگہ مناسب

آپ تو سارا دن باہر رہتے ہیں۔ اور یہاں تو یہ ہے"

"زاہد ہمہ وقت اِس طرح گھورتا رہتا ہے۔ جیسے کھا ہی تو جائے گا"

"فریدہ کی ہر وقت کی ماموں جان کے خلاف زہر نشانی"

اور وحید بھائی اللہ کی پناہ

ان کے بس میں ہو تو ابھی میرے دو بول زاہد سے پڑھا دیں۔ میں ابھی تک

اس وجہ سے چُپ تھی۔ بھائی جان کہ یہ تینوں مل کر کوئی بڑا قدم اٹھانے کی کوش

تو پھر آپ اور خالہ سے کھل کے بات کروں گی۔ اچھا ہوا آپ نے خود ہی پُوچھ لیا

جیسے بھائی کی موجودگی مجھے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

"فکر نہ کرو زلی۔ میں یہ سب کچھ بہت جلد ختم کر دوں گا"

"کیا کریں گے آپ" منزہ نے پُوچھا۔

"ابھی جا کے ماموں جان کو فون کرتا ہوں"

"کیوں؟"

"یہی کہ انجم کو ساتھ لے آئیں اور تمہیں اپنے ہاں لے جا کر انجم بھائی سے شادی کر دیں"

"منزہ شرما گئی"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں بھائی جان کہ آپ جیسا بھائی میرے متعلق جو سوچے گا میرے

لیے وہ قابلِ اعتراض نہ ہو گا"

"بس یہی کچھ کہنا تھا اب تم جا کے آرام کرو"

منزہ اُٹھ کر باہر چل دی۔

توقیر نے پھر پکارا۔

"زلی!"

"جی بھائی جان"

"امی جان کو ذرا میرے پاس بھیج دینا"

"جی بہت اچھا۔

ساجدہ اندر آئی اور توقیر کے سامنے بیٹھ گئی۔

کیا کہا منزہ نے"

وہ تو سخت نفرت کرتی ہے تینوں سے کہہ رہی تھی۔ میں آپ اور خالہ کی وجہ سے

چُپ رہی ورنہ ان نامناسب باتوں کا معقول جواب اُن کے مُنہ پر مارتی"

گویا وہ زاہد سے شادی پر رضامند نہیں"

ہرگز نہیں وہ انجم بھائی کو پسند کرتی ہے۔ زاہد سے تو اسے نفرت ہے اور نفرت

بھی سخت قسم کی۔"

"پھر کیا۔ بس بلاتا ہوں ماموں جان کو۔"

"جاؤ پھر فون کر آؤ جا کر۔"

"بس ابھی گیا امی جان!" توقیر کھڑا ہوا۔ اور

اور سامنے میز پر پڑا ہوا اپنا ریڈ اینڈ وائٹ کا پیکٹ اور ماچس اٹھا کر باہر نکل گیا

برآمدے میں اس کی مڈبھیڑ شہناز سے ہو گئی۔ توقیر کو دیکھتے ہی بولی۔

"کہاں چلے بھائی جان!"

"بازار جا رہا ہوں ذرا۔"

"میں بھی چلوں گی آپ کے ساتھ۔"

"کیوں؟"

"کام ہے ایک"

"ابھی تو دیکھو ساڑھے سات بج رہے ہیں۔ دن کو چلیں گے کسی روز۔"

اللہ بھائی جان! دن کو آپ رہتے ہی کہاں ہیں گھر۔ پتہ نہیں کیسی ملازمت کی آپ نے، صبح ہی صبح نکلتے ہیں۔ اور شام کو اس وقت آن گھستے ہیں ہم لوگ تو آپ سے کرنے کو ہی ترس گئے ہیں۔"

"اچھا باتیں نہ بناؤ۔ میں چلا۔"

شہناز نے اس کا بازو پکڑ لیا اور کھینچتی ہوئی ساجدہ کے پاس لے آئی۔

"امی! بھائی جان کو کہیں نا مجھے بھی بازار ساتھ لے جائیں۔"

ساجدہ کو فوراً جیسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔

"لے جاؤ بیٹا! کئی دنوں سے میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ کالج جانے کے لیے اس کے اس ایک ہی چپی ہے۔ وہ بھی ٹوٹتی جا رہی ہے۔ کوئی اچھی دینا اسے۔"

"صبح اسے لے جاؤں گا امی۔"

"صبح یہ کالج ہوگی۔"

"بڑا تنگ کیا ہے اس بلا نے۔" توقیر نے شہناز کا کان پکڑ لیا۔

"چلو آؤ پہلے تمہاری چپی لے کے تمہیں گھر چھوڑ جاؤں گا۔ پھر فون کروں گا جا کے۔"

دونوں بہن بھائی ہنستے ہوئے باہر نکل گئے۔

دوسرے روز توقیر دوپہر کے قریب مارکیٹ سے گھر لوٹا تو صابر اور انجم ا
کمرے میں ساجدہ اور شہناز کے ساتھ بیٹھے تھے۔ توقیر کو دیکھتے ہی صابر بڑے تپاک
سے ملے۔ انجم نے اُٹھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔

"موٹے ہو گئے ہو توقیر!" انجم نے خوش طبعی سے کہا۔

توقیر بھی مسکرا پڑا۔

"آپ بھی تو خوب پھول گئے ہیں بھائی جان!"

"سناؤ کیسے ہو؟"

"اچھی ہی گزر رہی ہے بھائی جان۔" توقیر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "سنائیے!"

"سب خوش ہیں۔ فرحت تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ اور جاوید تو بس ہر وقت بھائی
توقیر بھائی توقیر بھائی چلاتا رہتا ہے۔ دونوں بہن بھائی ہمارے ساتھ ہی آنا چاہتے تھے
لیکن ہم نے بڑی مشکل سے ٹالا ہے انہیں۔ امی جان بھی بہت گلے شکوے کر رہی تھیں کہ
توقیر نے یہاں آنا ہی بند کر دیا ہے۔ اور واقعی کئی ماہ سے تم نے ہمارے ہاں تو چکر ہی نہیں
لگایا۔"

"بس بھائی وقت ہی نہیں ملتا۔"

"کیا کرتے رہتے ہو؟"

"بتاؤں گا پھر کبھی آپ کو۔"

"سروس کرتے ہو کہیں؟"

"کر رہا ہوں ایک چھوٹی سی۔"

"تم نے نہ مجھے اپنے پاس ہونے کا لکھا ہے نہ ہی سروس کے لیے۔ اب میں اپنے
پاس ہی تمہارے لیے کسی اچھی سی سروس کی کوشش کروں گا۔"

توقیر کے جواب دینے سے پہلے ہی صابر بول پڑے۔

"توقیر! رات ٹیلیفون پر تو مجھے تمہاری باتوں کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ یہاں آ کر
آپ سے حالات کا تفصیل سے پتہ چلا تو یقین آیا کہ معاملہ واقعی نازک ہے۔"

توقیر نے خوش طبعی سے کہا۔

"شکر ہے آپ کو یقین تو آیا۔ بھابی سے ملاقات ہوئی آپ کی؟"

"ہاں ملی ہے۔ پر خفا خفا سی ہو کر۔ جب سے ہم یہاں آئے ہیں اس نے تو جھوٹے

منہ بھی کسی چیز کے لیے نہیں پوچھا۔ میں تو اسے اچھا سمجھتا تھا لیکن اب پتہ چلا کہ اڑنگا ہے یہ تو۔"

ساجدہ نے بھی تائید کی۔

"[illegible] کیا۔ ہے ہی ایسی۔ موئی مردے شوئی۔ بہو کیا ملی گویا موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی۔ نہ ناک نہ منہ ہتّے بی برموہی۔"

توقیر نے بھی ہنس کے کہا۔

ماموں جان! ابھی تو آپ پوری طرح اس سے متعارف ہی نہیں ہوئے۔ بات بات میں محترمہ سے نکلی پڑتی ہیں۔ اور جب کبھی غصہ میں ہوتی ہیں۔

اللہ رے۔ ناگ پھن کی طرح خاردار ہو جاتی ہیں۔"

صابر ہنس پڑے۔

"بڑا خوفناک نقشہ پیش کیا ہے توقیر تم نے تو۔ اگر ایسی ہے پھر تو واقعی بڑی خطرناک ہے۔ وحید بھی اسے منع نہیں کرتا۔"

"توبہ کریں۔ ماموں جان! اس سے تو ڈرتے ہیں۔"

"تو گویا دودھیل گائے ہے گھر میں۔"

"بالکل۔ آپ جانتے ہی ہیں دودھیل گائے کی لاتیں بھی بھلی۔"

صابر اس بار ساجدہ سے مخاطب ہوئے۔

"آپا! تم ذرا منیرہ کو تو تیار کرو۔"

"وہ تو صبح کی تیار بیٹھی ہے بچاری۔"

تو پھر نکالیں اسے۔ ہم چلتے ہیں دیر ہو رہی ہے۔"

ساجدہ اٹھ کر باہر نکل گئی۔ شہناز بھی اس کے ساتھ ہی باہر چلی گئی۔

صابر چپ ہوا تو انجم نے توقیر سے کہا۔

"توقیر! کسی دن پھوپھی اور شہناز کو ساتھ لے کر آنا۔"

"ضرور آؤں گا بھائی جان۔"

اتنے میں باہر برآمدے میں اچانک ایک آواز سنائی دی۔

"میں کہتی ہوں ہٹ جاؤ پیچھے۔"

"بے شرم، بے حیا۔ منیرہ کی آواز تھی۔

بہت کمینے ہو زاہد ہٹو پیچھے۔" شہناز کی آواز تھی۔

توقیر کے کان کھڑے ہو گئے۔ لپک کر وہ باہر آیا۔ انجم اور صابر بھی اس کے ساتھ ہی برآمدے میں آ گئے۔ سامنے عجیب ہی منظر تھا۔ زاہد بڑی ڈھٹائی سے منیرہ کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ فریدہ بھی اس کے قریب تھی۔ ساجدہ اور شہناز منیرہ کو برآمدے سے باہر صحن میں لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن زاہد اسے روکے ہوئے تھا۔ منیرہ سخت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

توقیر کے دیکھتے ہی... ساجدہ نے ڈانٹ کے انداز میں کہا۔

"زاہد ہٹ جاؤ پیچھے۔ بات آگے نہ بڑھاؤ۔"

زاہد پکا ہی نوفر بن گیا تھا۔"

یہ یہاں سے نہیں جا سکتی۔ وحید بھائی کے آنے تک اسے یہیں رہنا ہو گا۔

پھر فیصلہ ہوگا۔"

توقیر غصے میں آپے سے باہر ہوگیا۔ بڑی تیزی سے وہ اس سمت بڑھا۔

انجم نے پیچھے سے اس کا شانہ پکڑ لیا۔

"ٹھہر جاؤ توقیر! اس غنڈے سے آج میں خود ہی نمٹ لیتا ہوں۔ اس نے میری غیرت کا امتحان لینے کی کوشش کی ہے۔ میں ابھی اسے بتاتا ہوں۔ کسی کی منگیتر کا راستہ کیسے روکا جاتا ہے۔"

توقیر نے اپنا شانہ چھڑا لیا۔ اور غصے میں چیخ پڑا۔

"بھیا! منزہ میری بہن ہے۔ بھائی کو اس کے فرض سے نہ روکو۔ میں ابھی اس گ
چوہے کو ٹھیک کر لیتا ہوں۔"

توقیر بھاگتا ہوا منزہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور زاہد سے ترش رُو اور بارُعب آوا
میں کہا۔

"پیچھے ہٹ جاؤ زاہد"

"نہیں ہٹتا" فریدہ نے کہا۔

زاہد کی ہمت اور بڑھ گئی اس نے منزہ کا بازو پکڑ لیا۔

"کوئی نہیں لے جا سکتا اِسے"

توقیر کی آنکھیں آگ برسا گئیں۔

"ڈز! ڈز!"

کمرہ دوبارہ پھر گونج گیا۔ زاہد پہلے سے بھی دُور جا گرا۔

توقیر واپس مڑا۔ منزہ کا اٹیچی اٹھایا اور اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

آؤ زلی! چلیں۔

زاہد کمرے میں ہی رہا۔

توقیر، منزہ، صابر اور انجم باہر نکل گئے۔

توقیر تینوں کو چھوڑ کر جب واپس گھر آیا تو زاہد لوہے کا ایک ڈنڈا پکڑ کر اس کے پیچھے پڑ گیا۔ اور زور زور سے بولنے لگا۔

میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔

خون کر دوں گا تمہارا۔

ڈنڈا پکڑے وہ تیزی سے توقیر کی طرف بڑھا۔

شہناز نے بیچ میں آنا چاہا لیکن توقیر چیخ پڑا۔

پیچھے ہٹ جاؤ شہناز۔ آنے دو اس باولے کتے کو میں اس کا سارا دیوانہ پن دُور
ادوں گا۔"

زاہد آگے بڑھا اور پوری قوت سے ڈنڈا توقیر کے دے مارا۔ توقیر فوراً ہی ایک طرف لڑھک کر ہٹ گیا۔ اور زاہد کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر دور پھینک دیا۔

دونوں گتھ گئے۔

اور ایک دوسرے کو خوب جھٹکنے لگے۔

کبھی توقیر اوپر زاہد نیچے۔

کبھی زاہد اوپر توقیر نیچے۔

سوچ سمجھ کر قدم اٹھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو مات کرنے کے لیے جھڑا جھڑ برستے مکوں۔ طمانچوں اور لاتوں کا طوفان سا چل گیا تھا۔ گھر کا صحن کیا ہوا، فری سٹائل کشتی کا میدان سا بن گیا تھا۔ ساجدہ، فریدہ اور شہناز خاموش کھڑی دیکھ رہی تھیں سب کے سب ہمہ تن گوش ہو گئے تھے۔

زاہد کا سانس جان کی پھانس بنتا جا رہا تھا۔

توقیر نے اچانک اسے پٹخ دیا۔ پھر گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور لگاتار کسی خودکار مشین کی طرح کئی زوردار گھونسے زاہد کے پیٹ پر داغ دیئے۔ زاہد کرب انگیز سا ہو بلبلا پڑا۔ توقیر اب بڑی تیزی سے اس پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔ بالکل اس کینہ پرور سرکش اونٹ کی طرح جو بغض و عناد اور انتقام میں بالکل ہی اندھا ہو کر جھپٹنے کی کوشش کرتا ہو۔

یہی حال کچھ توقیر کا بھی ہو گیا تھا۔ ہر سو سے وہ اپنے ناقابل برداشت مکوں سے زاہد پر پل پڑ رہا تھا۔ زاہد کے دونوں ہاتھ بے جان سے ہو کر لٹک گئے تھے پل دو پل بس وہ نڈھال اور بے بس ہو کر گرنے ہی والا تھا۔

ساجدہ نے جو یہ منظر دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھی اور توقیر کا بازو پکڑ کر اسے علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن اس نے غصے میں ساجدہ کو پیچھے ہٹا دیا۔

"ہٹ جاؤ ماں! یہ بدمعاش اب اس گھر میں نہیں رہے گا۔ جان سے مار دوں گا میں اسے۔"

ساجدہ نے پھر اسے علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔

لیکن توقیر نے پھر اسے پیچھے ہٹا دیا۔

ساجدہ کو شاید طیش آ گیا تھا۔ اپنے بوڑھے ہاتھوں کا ایک سنسناتا طمانچہ توقیر کے منہ پر دے مارا۔

"میں کہتی ہوں چھوڑ دو اسے۔"

توقیر نے غصے میں احتجاج کیا۔

"ماں! لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے کچھ سوچا اور اپنے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے سر جھکا لیا۔

فریدہ بھی اتنی دیر تک آگے بڑھی اور زاہد کو پکڑ کر زور زور سے گالیاں دینے لگی۔

لُٹ پڑو تم توقیر کچھ نہ رہے تمہارا۔

مر جاؤ اور ہمارے سر سے اُتر جاؤ۔

آ لینے دو تمہارے بھائی کو آج۔ اِس گھر سے تمہیں نکال کے نہ رہی تو فریدہ نام نہیں۔

زاہد کو پکڑ کر وہ ایک طرف لے گئی۔

ساجدہ توقیر کے کمرے میں چلی گئی۔

شہناز ابھی تک غصے میں بل کھا رہی تھی۔ ساجدہ کے پیچھے پیچھے وہ توقیر کے کمرے میں آئی اور ساجدہ کو آڑے ہاتھوں لیا۔

امی! تم نے بھائی جان پر ہاتھ اٹھایا جن کا کوئی قصور نہیں۔ اِس ذلیل کو

کچھ نہ کہا جو اس سارے لڑائی جھگڑے کی ابتدا اور وجہ ہے۔

شہناز رُکی اور پھر کہتی ہی چلی گئی۔

امی! زاہد نے بھائی جان کو مارنے میں پہل کی اور آپ نے کچھ نہ کہا۔

بھائی جان پر اس نے لوہے کا ڈنڈا اٹھایا۔

تم خاموش رہیں اور منہ میں گھنگھنیاں ڈال لیں۔

بھائی نے بھائی جان کو اُلٹی سیدھی گالیاں دیں۔

تمہارے لب پھر بھی نہ کھُلے۔

کیوں۔ آخر کس حساب میں۔ تمہارے خون نے کیوں جوش نہیں مارا امی! ابر مجھے یہ بات بتاؤ۔ میرے سامنے بھائی کی بے عزتی ہو۔ میں اسے برداشت کر سکتی۔

ساجدہ کچھ بولنے بھی نہ پاتی تھی کہ توقیر اندر آیا اور ساجدہ کے پاؤں کو چھوتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا مجھ سے غلطی ہوگئی ہو تو معاف کر دو امی! میں بہت بد انسان ہوں جس پر آج ماں کا ہاتھ اُٹھ گیا ہے۔ معاف کر دو امی! معاف کر دو!

شہناز ہچکیاں لے کر رو دی۔

ساجدہ کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔ توقیر کو اٹھا کر اُس نے لپیٹ لیا۔

میرا ہاتھ تم پر ہی اُٹھ سکتا تھا بیٹا! تم پر میرا زور جو چلتا ہے تو چلا لیا بیٹا! اس پر میں ہاتھ کیسے اٹھاتی؟"

شہناز اور ساجدہ کھُل کے رو دیں۔

توقیر نے اپنا سر ماں کے سینے پر رکھ دیا۔ آنسوؤں کے کئی موٹے موٹے قطرے اس کی آنکھوں سے گرے اور ماں کے دوپٹے میں جذب ہو گئے۔

کوئی تین گھڑی رات گئے جب کہ توقیر اپنے کمرے میں ساجدہ اور شہناز کے ساتھ بیٹھا تھا وحید کمرے میں آیا اور توقیر کے سامنے بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"آج گھر میں جھگڑا ہوا توقیر!"

"بھابی نے آپ کو بتایا ہی ہوگا" توقیر نے میٹھے پن سے کہا۔

اتنی دیر میں زاہد آگیا۔ اس کے ہاتھ میں وہی لوہے کا ڈنڈا تھا پیچھے پیچھے فریدہ بھی تھی۔ زاہد نے آتے ہی بھونکنا شروع کر دیا۔

اس توقیر کے بچے کو چھوڑنا نہیں ہے آج وہ ڈنڈا ہوا میں لہرانے لگا۔

توقیر کو طیش آگیا۔ ساجدہ اور شہناز بھی کھڑی ہوگئیں۔

وحید نے زاہد کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا۔

"تم چپ رہو زاہد۔ مجھے بات کرنے دو"

"تم نے زاہد کو مارا کیوں توقیر! وحید نے بات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

توقیر نے حقیقت بیانی سے کام لیا۔

"جس نے آپ کو اتنا کچھ بتایا ہے۔ اِس سے وجہ بھی پوچھ لی ہوتی آپ نے۔ زاہد نے امول جان اور انجم کی موجودگی میں منزہ کا راستہ روکا۔ اور میں کیسے چپ ہو رہتا وحید نے جھوٹ بولا۔

"یہ تو میں نے اسے کہا تھا کہ میری غیر موجودگی میں منزہ کہیں نہ جائے"

توقیر نے خفگی میں کہا۔

"یہ بھی آپ نے ہی کہا ہو گا کہ وہ سرِعام منسرہ کا بازو پکڑ لے۔"

"تو کیا ہوا اتنی بڑی بات تو نہیں۔ زاہد کو مارنے کے علاوہ تم نے فریدہ کو گالیاں بھی دیں۔"

توقیر کی طبیعت الجھنے لگی۔

"آپ کو یقین ہے میں بھابی کو گالیاں دے سکتا ہوں۔"

"فریدہ جو کہہ رہی ہے تو سچ ہی ہو گا۔"

بھابی خدا کو ماننے سے انکار کر دے تو آپ بھی اس کی اندھی تقلید میں ایسا ہی کہنے لگے۔"

وحید غصّے میں آ گیا۔

توقیر! تمہاری زبان دراز ہو گئی ہے۔ یا بھابی کی زبان جھوٹ کہنے میں خاصی ہو گئی ہے۔"

وحید زور سے چلّایا۔ "توقیر!"

بھابی کے خلاف تو آپ کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں ہیں نا۔ وہ جو کہے آپ کے لیے قرآن اور حدیث اور بھائی، ماں اور بہن جو کہے وہ سب جھوٹ اور بکواس یہی نا آپ کے خیالات۔"

وحید اور بھی بھڑک گیا۔

"زیادہ آگے نہ بڑھو توقیر۔"

توقیر نے بھی تاؤ سے کہا۔

میں آگے بڑھ رہا ہوں یا آپ ہی بہت زیادہ گرتے جا رہے ہیں۔ میں آج تک بڑے بھائی کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے سامنے اونچا تک نہ بولا۔ لیکن آپ بیوی کے ہوتے ہوئے ہر چیز سے غافل ہو گئے۔

میری پڑھائی کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔

شہناز کو آج تک آپ کی طرف سے سکول اور کالج کے خرچ کے لیے ایک دمڑی نہ ملی۔

ماں کا آپ کو خیال نہیں کہ کس طرح پیٹ پال رہی ہے۔ مگر

مگر آپ کو کیا۔ ملازمت کرے یا بھیک مانگے آپ اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہیں۔"

وحید پوری قوت سے چلّایا۔

"چُپ رہو توقیر۔"

لیکن توقیر تو اب چل نکلا تھا چپ کیسے ہو جاتا۔ برسوں کی بھڑاس نکالنے پر تُل گیا تھا۔

"آپ کو بیوی کیا ملی بھائی جان! کہکشاں کے چمکتے ہوئے موتیوں کی جھالر مل گئی جس کی چمک دمک اور سج دھج میں آپ سب کو بھول گئے۔"

وحید غصّے میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ لوہے کا ڈنڈا اٹھا کر اس نے پوری قوت سے توقیر کے دے مارا۔ توقیر نے پیچھے ہو کر بچنا چاہا۔

لیکن ہائے افسوس۔

اسی کوشش میں لوہے کا ڈنڈا اُس کی پیشانی پر پڑا اور ——— اس کی
پیشانی پھٹ گئی۔ دھاروں سُرخ سُرخ خون بہہ نکلا۔ توقیر کرسی سے گرا اور بے ہوش ہو
گیا۔ وحید، فریدہ اور زاہد بالکل باہر نکل گئے۔ ساجدہ اور شہناز روتی دھوتی اس کی
طرف بھاگیں۔ جلدی جلدی اُس کے پٹی باندھی۔ اور بڑی مشکل سے اُسے ہوش میں
لائیں۔ گرتے پڑتے توقیر کھڑا ہوا۔ لیکن دوسرے لمحے کرسی سے ٹھوکر کھائی اور
گر گیا۔ دوبارہ افتاں خیزاں اُٹھا اور چلانے لگا۔

"مجھے کیا ہو گیا ہے امی! کیا ہو گیا ہے مجھے" ساجدہ رو دی۔

"صبر کرو بیٹا"

توقیر نے درد آمیزی سے کہا۔

"مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ماں! کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ میں اندھا ہو گیا ہوں
بالکل اندھا۔ دوبارہ اس نے میز سے ٹھوکر کھائی اور تیورا کر گر پڑا۔ ساجدہ اور
نے پھر اسے اٹھایا اور دونوں ماں بیٹی دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ توقیر کی بینائی جا
رہی تھی"

توقیر دو ماہ تک ہسپتال پڑا رہا۔ پیشانی کا زخم تو ٹھیک ہو گیا۔ لیکن ہائے افسوس آنکھیں
ٹھیک نہ ہوئیں۔ اور وہ اپنی بے نور آنکھیں لیے گھر آ گیا۔ زندگی بدمزہ اور بے مقصد ہو
کر رہ گئی تھی۔ سارا سارا دن وہ اپنے کمرے میں بند پڑا رہتا۔ ساجدہ لاکھ اس کی دلجوئی
کرتی۔ اس کے بی۔ اے کے امتحان ختم ہو چکے تھے اور زیادہ وقت وہ توقیر کے پاس
ہی گزارتی مگر ——— الٰہی توبہ

توقیر کا سکھ چین تو ڈال سے ٹوٹے ہوئے خشک پتوں کی طرح بکھر گیا تھا۔ زندگی اندھیر
ہو گئی تھی۔ قدم قدم پر دوسرے کا محتاج۔ زندگی کے ہر موڑ پر رہنما کی ضرورت۔ اٹھنے
بیٹھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے حتیٰ کہ ہر قدم پر دوسروں سے پرچک لینا ضروری تھی۔

ہائے بچارے اندھے

کیا ہست و بود ہوتی ہے ان کی بھی ۔

نہ رنگ و روشنی کی خبر

نہ اپنی نہ پرائے کی شناخت

نہ دور نہ نزدیک کی پہچان

اندھا، کیسا اُداس اور غمناک لفظ ہے۔

توقیر کی بھی آج بُری حالت تھی اپنے بستر میں لیٹا وہ اکیلا پڑا رو رہا تھا! موٹے بے نور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے چھم چھم تکیے پر گر رہے تھے۔ اتنے ساجدہ کمرے میں آئی اور دُکھ سے کہا۔

"ذرا سا باہر نکلی اور تم رونے لگے۔ اس طرح کیسے گزارا ہو گا بیٹا! اٹھو دودھ پی لو"

توقیر سِسک پڑا

مجھے کچھ نہیں چاہیئے ماں! کچھ نہیں چاہیئے"

وہ رُو دیا۔

ساجدہ اپنے آنسو پی گئی۔

"اتنے جان ہار نہ ہو بیٹا!"

توقیر نے ہچکیوں میں کہا۔

"ماں! اندازاً ایک انسان ستر برس تک تو زندہ رہ ہی لیتا ہے۔ میرے ا

ابھی بیس برس گذرے ہیں۔ باقی پچاس سال میں کیسے گزاروں گا۔ کس طرح بسر کروں گا اتنے اس پہاڑ کو ماں! مجھے یہ صدیوں کی رات ایسی زندگی نہیں چاہیئے"

ساجدہ بھی رو پڑی۔

"صبر کرو بیٹا! مقدر نے جو کچھ تمہاری جھولی میں ڈال دیا ہے اسے صبر کے ساتھ قبول کرو۔ تقدیر لکھنے والے فرشتوں کا کوئی ہاتھ پکڑ کر تبدیلی تو نہیں کر سکتا۔

شہناز دودھ کا گلاس لیے اندر آئی۔ ماں اور بھائی کی باتیں سن کر اس کا دل دُکھ گیا ساجدہ کے قریب ہی وہ خاموش کھڑی ہو گئی۔

توقیر سوز آمیز آواز میں پھٹ پڑا۔

مجھے جینے کی کوئی آرزو نہیں۔

موت دے دے تو خدا بہتر ہے۔

میں جینا نہیں چاہتا۔

مجھے زندگی نہیں چاہیئے۔ یہ اندھی زندگی مجھ سے نہیں گزرتی۔

مر جانے دو ماں! مر جانے دو مجھے۔ توقیر زور زور سے اپنا سر پلنگ کے پائے پٹخنے لگا۔

شہناز نے دودھ کا گلاس میز پر رکھ دیا اور کرسی پر دھم سے گر کر رونے لگی۔

تھوڑی دیر تک تینوں دھارم دھار روتے رہے۔ آخر کار ساجدہ سنبھلی بڑی مشکل سے توقیر کو تسلی دے دے کر چپ کرایا۔ شہناز نے بھی اپنے آنسو پونچھ لیے اور اُٹھ کر توقیر کو دودھ پلانے لگی۔

توقیر سنبھل گیا تھا۔ کمرے میں کاٹ کھانے والی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شہ
کو کچھ سوجھا اُٹھی اور الماری پر پڑا ہوا وائلن اُٹھا کر توقیر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے

"بھائی جان! آج وائلن سنا دیجیئے نا"

کیا کرتی بھائی کا دل بہلانا چاہتی تھی نا

توقیر نے مدہم آواز میں کہا۔

نہیں شہناز! دل نہیں چاہ رہا"

شہناز نے ضد کی۔

"سُنا دیجیئے نا بھائی جان! بس بہن کی اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر
آپ"

توقیر نے وائلن پکڑ لیا۔ اور

اور پھر ——— مدہم اور پُرسوز دھن میں تاریں گنگنا اُٹھیں۔

اے مصور تری تصویر ادھوری ہے ابھی۔

شہناز بھائی کا دل بہلانا چاہتی تھی۔ لیکن تاروں کی دل سوز آواز نے اُسے
رونے پر مجبور کر دیا۔ توقیر کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں۔

توقیر بجاتا رہا۔

اور شہناز آنکھوں ہی آنکھوں میں روتی رہی۔

ساجدہ کے لیے منظر ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ فوراً وہ اٹھی اور وائلن توق
لے کر اپنے سامنے الماری پر رکھ دیا۔ توقیر کو اس نے لٹا دیا اور دوبارہ اپنی جگہ پر

رات ہر لمحہ بھیگتی ہوئی گہری ہی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ باہر ہمہ سو اندھیرا ہی اندھیرا
تھا بھیق اور اُداس اُداس سی خاموشی ہر چیز میں حلول کر گئی تھی۔

فضائیں خاموش تھیں۔

درخت اُداس کھڑے تھے۔

پرندے درختوں میں دبک کر سو رہے تھے۔

رات اونگھتی جا رہی تھی۔

سکوت ہی سکوت تھا۔

گہرا سکوت

دُور محلے کی کسی گلی میں اچانک کوئی کتا رونے لگا اور فضاؤں میں ایک ہلچل سی
ہو گئی۔ اور پھر ایک ساتھ کئی کتے بھونک پڑے۔

کچھ اُس طرح جیسے

جیسے اُنھوں نے کوئی بد روح دیکھ لی ہو۔

سیاہ رات میں شور کا ایک جھکڑ سا چل نکلا اور ختم ہو گیا۔

گہری سیاہ رات۔

بےبسوں اور غریبوں کی بےبسی اور بےمائیگی پر قہقہے برسانے والی گہری سیاہ رات
پھر خاموشی کے رتھ پر بڑی تیزی سے اپنی منزل کو بھاگ نکلی

ساجدہ اور شہناز اسی طرح توقیر کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھیں کہ وحید کمرے میں
آیا۔ آتے ہی اس نے پہلے سوتے ہوئے توقیر پر نگاہ ڈالی۔ اور پھر ماں سے کہا۔

"توقیر سوگیا ہے ماں!"

ساجدہ نے ہولے سے کہا۔

سو ہی گیا ہے میرے خیال میں۔ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں" اُس نے آہستگی سے پکارا۔

"توقیر! ـــــ توقیر!"

توقیر جاگ رہا تھا۔ لیکن جان بوجھ کر سوتا بن گیا۔

"کام ہے کوئی" ساجدہ نے پوچھا۔

وحید بیٹھ گیا۔

شہناز نے غور سے ایک بار ماں کی طرف دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ برآمدے میں ہی دروازے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اس لئے کہ شاید وحید ماں کے ساتھ توقیر کے متعلق اگر کچھ کہے تو وہ سُن سکے۔

ساجدہ نے پوچھا۔

"کیا بات ہے"

شہناز کے کان کھڑے ہو گئے۔ بستر پر لیٹا ہوا توقیر بھی کان لگا کر سُننے لگا

وحید آہستگی سے بولا۔

توقیر اندھا تو ہو ہی گیا ہے امی! یہ ہم پر بوجھ بن گیا ہے۔ کب تک آپ قدم قدم پر اس کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ میرا ارادہ ہے کسی کو مستقل ہی اس کا سہارا بنا

ساجدہ نے تیز نگاہوں سے پوچھا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔ صاف صاف کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو"

"مطلب یہ ہے امی! شہناز اور توقیر کی شادی کر دی جائے"

شہناز کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ رہا۔ کہ ایسی بات کہی گئی ہے۔

توقیر کے دل میں دھواں سا اٹھا اور ذہن میں عجیب سے وسوسے ناچ اٹھے۔ اس کے دل نے پکارا۔ سگی بہن سے شادی کیونکر ہو سکتی ہے۔ اس کا جی چاہا اُٹھ کر وحید کا منہ نوچ لے لیکن پوری بات خاموشی سے سننے کی جستجو غالب آگئی تھی۔

ساجدہ نے کھا جانے والے انداز میں کہا۔

"یہ ساری رام کہانی فریدہ نے کہی ہوگی تمہیں۔ شہناز کی شادی کے اخراجات میں خود برداشت کر لوں گی۔ تم جیسے کپوت پر میں کوئی بوجھ نہ ڈالوں گی۔ تم دونوں میاں بیوی اس گھر میں جو ڈرامہ کھیلنا چاہتے ہو اس کی میں تمہیں ہرگز اجازت نہ دوں گی"

شہناز غصے سے بے قابو ہو کر کمرے میں آگئی اور قہر آلود ہو کر وحید سے کہنے لگی۔

"بھائی جان! آپ کو شرم نہیں آتی۔ سگے بہن بھائی کی بھی کبھی شادی ہوئی ہے"

وحید نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم چپ رہو شہناز۔ توقیر تمہارا سگا بھائی نہیں ہے"

شہناز چیخ پڑی۔

"جھوٹ کہتے ہیں آپ"

وحید کھڑا ہو گیا۔

"یقین نہ ہو تو امّی سے پُوچھ لو"

پھر اُس نے ساجدہ سے کہا۔

"ماں! اس معاملہ پر سوچ بچار کے بعد مجھے کچھ بتایا"

وحید تیزی سے باہر نکل گیا۔

توقیر کے دل و دماغ میں تجسس اور شک و شبہ کی لہریں پھیل گئی تھیں

شہناز کا ذہن بھی پلٹا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا کہ یہ سب بکواس ہے۔ آخر اسے نہ رہا گیا اور ساجدہ سے پوچھ ہی لیا۔

"امی! کیا توقیر بھائی کی میں سگی بہن نہیں"

ساجدہ نے سر جُھکا لیا۔

شہناز نے اُسے جھنجھوڑا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو ماں!"

ساجدہ غم اور اندوہ میں کہیں دُور سے بولی۔

"نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے شہناز"

"تمہیں بتانا ہو گا ماں۔ میرا اور توقیر بھائی کا کیا رشتہ ہے؟"

ساجدہ نے غمگین لہجے میں کہا۔

"کچھ بھی نہیں"

"کیا وہ میرے بھائی نہیں"

"نہیں"

"کیا وہ آپ کے بیٹے نہیں"

ساجدہ نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں صرف وحید اور تم بہن بھائی ہو۔ توقیر میرا لڑکا نہیں"

شہناز رو دی۔

"تو پھر یہ کس کے لڑکے ہیں امیّ!"

"سُنو آج سے اٹھارہ برس قبل یہ مجھے ایک گلی میں پڑا ملا تھا اور میں نے گود لے لیا تھا۔ پتہ نہیں کس دکھیاری ماں کا گم ہو گیا تھا"

توقیر نے جب یہ انکشاف سُنا تو اس کا ذہن سُن سا ہو گیا۔ اس کا جی چاہا چیخ کر اپنی بے بسی کا اعلان کرے لیکن کچھ نہ کہہ سکا۔ صرف غم اور فکر کے باعث اس پیشانی ضرور عرق آلود ہو گئی تھی۔

شہناز پھر بولی۔

"ماں! کاش وحید کو آپ نے گود لیا ہوتا اور توقیر میرے سگے بھائی ہوتے انہوں ہمارے لیے وہ کچھ کیا جو آپ کا حقیقی بیٹا بھی نہ کر سکا۔ اَب مجھ پر بھید کھلا ہے کہ وحید بھائی اور فریدہ بھابی کیوں ہر وقت توقیر بھیا سے لڑتے اور جھگڑتے رہتے تھے۔ یہ اگر ہمارے سگے بھائی ہوتے تو وحید بھائی انہیں لوہے کا ڈنڈا مار کر اندھا نہ کر دیتے۔ کاش وحید بھائی اندھے ہو گئے ہوتے اور توقیر بھیا ہمارے دُکھ سُکھ بانٹنے کو ہمیشہ ہمارے ساتھ سلامت رہتے۔

توقیر کی عجیب حالت تھی۔ بیچارہ شہناز کی باتیں سُنتا رہا اور روتا رہا۔ ہونٹ

اس نے سختی سے بھینچ لیے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا تیز دھارا جاری تھا۔

ساجدہ نے اندوہگیں انداز میں کہا۔

"میں تو توقیر کو ہی اپنا حقیقی بیٹا سمجھتی ہوں شہناز! وحید جیسا کپوت بیٹا تو مرا

بھلا نہ اسے ماں کی پرواہ،

نہ بہن کی خبر

توقیر جیسا دردمند اور غمگسار بیٹا کسی مقدر والے ماں باپ کو ہی ملتا ہے۔ ما

نے سوچا کچھ تھا لیکن ہو کچھ اور ہی گیا۔ ارادہ تھا توقیر اب کمانے لگا ہے تو ہم ماں بیٹا

لیے ایک علیحٰدہ مکان بنا کر پہلے تمہارے ہاتھ پیلے کریں گے اس کے بعد کسی اچھی

شریف لڑکی سے توقیر کو بیاہ دوں گی۔ لیکن مقدر نے تو میرے بچے سے آنکھوں کا نور

چھین لیا۔ میں ہمت نہیں ہاروں گی۔ میں محنت مزدوری کروں گی۔ پر اپنے بچے

نہ مرنے دوں گی"

توقیر اسی طرح رو رہا تھا۔

شہناز نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

امی! ہم دونوں ماں بیٹی محنت کر کے پیسہ جمع کریں گی۔ اور بھائی جان کی

کا آپریشن کرائیں گے۔ مجھے اُمید ہے بھائی جان کی بینائی ضرور لوٹ آئیگی"

ساجدہ نے خوش ہو کے کہا۔

"ہم ضرور ایسا کریں گے۔ توقیر کی خاطر تو میں اپنی جان بھی بیچ دوں گی" توقیر

شاید بھول گیا تھا کہ وہ سوتا بنا ہوا ہے۔ غلطی سے اُس نے کروٹ لے لی۔ ساجدہ

ذرا سنبھل گئی اور ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے شہناز کو چپ رہنے کے لیے کہا۔

شہناز بات کا رُخ ہی بدل گئی۔

چلو اپنے کمرے میں چلیں امی! سونے دیں بھائی جان کو"

ساجدہ کھڑی ہو گئی۔

"ہاں۔ آؤ چلیں"

دونوں ماں بیٹی کمرے سے نکل گیا ہو۔ ... دن کے پیچھے

برآمدے میں جب تک قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی۔ توقیر لیٹا رہا۔ جب

خاموشی چھا گئی وہ اُٹھا اور پاؤں سے ٹٹول کر جوتا پہنا۔ ہاتھوں کو وہ اپنے آگے آگے

ہلاتا ہوا کمرے سے باہر آیا۔ اور برآمدے کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوتا ہوا ایک کمرے

میں داخل ہوا اندر ساجدہ اور شہناز باتیں کر رہی تھیں۔ توقیر کو دیکھتے ہی دونوں بوکھلا

کر کھڑی ہو گئیں۔ ساجدہ آگے بڑھی اور توقیر کا بازو پکڑ کر کرسی پر لا بٹھایا۔

"کیا بات ہے بیٹا! تم سوئے نہیں"، ساجدہ نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

توقیر کے چہرے پر سوچ و بچار کی لکیریں خاصی نمایاں تھیں۔

"نیند نہیں آ رہی تھی ماں! اس لیے اِدھر چلا آیا"

تم نے مجھے آواز دی ہوتی۔ میں خود تمہارے پاس آ جاتی"

ایک ضروری کام ہے ماں! اس لیے چلا آیا ہوں"

شہناز نے پیار سے کہا۔

"آپ کو جب کوئی کام ہو تو مجھے یا امی کو وہیں بُلا لیا کریں بھائی جان!"

توقیر نے بڑے درد سے کہا۔

"ماں! مجھ پر ایسا وقت آگیا ہے جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ بدل دیا ہے۔"

ساجدہ کانپ گئی۔

"کیا ہوگیا ہے بیٹا تمہیں؟"

"ماں! تمہیں وحید اور شہنانہ۔ سچ کہنا مَیں کس کا بیٹا ہوں؟"

ساجدہ کی روح تک لرز گئی۔

"توقیر! لرزتی آواز میں اس نے کہا۔

"سچ کہہ دو ماں! اُس کمرے میں تمہاری وحید اور شہناز کی سب باتیں سُن چکا ہوں۔"

ساجدہ چپ رہی

"کچھ کہو ماں! میرے دل میں آگ سی جل رہی ہے۔ مَیں پاگل ہو جاؤں گا ماں! جسم میں آگ بھر دی ہے کسی نے۔"

ساجدہ کو بولنا ہی پڑا۔

آج سے اٹھارہ برس قبل تم مجھے گم شدہ حالت میں بازار کی ایک گلی میں پڑے ملے تھے۔ میں تمہیں اٹھا لائی اور پال لیا۔ مَیں تو تمہیں اپنا حقیقی بیٹا ہی سمجھتی ہوں۔ پتہ نہیں تم کس دکھیاری ماں کے گم ہو گئے تھے میں نے کبھی اس کے خلاف کوئی شکایت بھی نہیں کی ماں!

مجھے بھی تمہاری سعادت مندی کا پُورا بھروسہ ہے۔"

"ایک بات اور بتاؤ ماں!"

"پُوچھو!"

میرا نام شروع ہی سے توقیر ہے۔

نہیں بیٹا! تم اُس وقت دو برس کے تھے اور تم نے پُوپلی زبان میں اپنا نام تنویر بتایا تھا۔ میرا ایک بیٹا دو برس کا ہو کے مر گیا تھا۔ بالکل تم جیسا پیارا تھا ان کی یاد میں تمہارا نام میں نے تنویر میں بدل کر توقیر رکھ دیا۔"

توقیر ہلکے سے بڑبڑایا۔

"تنویر، پروین، کنول اور ماں۔"

ساجدہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

"یہ پروین اور کنول کون ہیں بیٹا؟"

توقیر ٹال گیا۔

"کچھ نہیں ماں! میرا ذہن اُلجھ گیا تھا۔ سوچ رہا تھا نام بدلنے سے کبھی مقدر بھی بدلے ہیں۔ آج سارے بندھن توڑ کر تقدیر ایک نئے روپ میں میرے سامنے آن کھڑی ہوئی ہے۔"

ساجدہ نے اسے تسلّی دی۔

اتنی گہری سوچوں میں نہ جاؤ بیٹا! ہم دونوں ماں بیٹی تو آج تک تمہارے ہی سہارے جی رہی تھیں۔"

توقیر پگھل گیا۔

"میں اقرار کرتا ہوں ماں! شہناز جیسی بہن اور آپ جیسی ماں کسی خوش نصیب انسان کو ہی ملتی ہیں۔"

شہناز بھاگ کر توقیر سے لپٹ گئی۔

"بس کرو بھیا۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔ ایسی باتوں سے دل دکھتا ہے چلیے اٹھیے! میں آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ آتی ہوں۔ آرام کریں اٹھ کر۔ کتنی رات جا چکی ہے"

توقیر نے ٹٹول کر شہناز کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بس اٹھتا ہوں شہناز! صرف ایک بات اور پوچھ لینے دو۔ شاید میرے بھٹکے ہوئے دل کو چین نصیب ہو جائے۔" وہ پھر ساجدہ سے مخاطب ہوا۔

"ماں! جب میں آپ کو ملا تھا۔ کچھ پہنے ہوئے تھا میں؟"

ساجدہ بیچاری کی حالت بھی غیر ہوتی جا رہی تھی بڑی مشکل سے اس نے کہا۔

"تم اس وقت بشرٹ، پاجامہ گرم جرسی، سر پہ اونی ٹوپی اور بوٹ پہنے ہوئے تھے۔"

"وہ کپڑے کیا ہوئے۔ پھٹ گئے کیا؟"

"نہیں۔ میں نے سنبھال کے رکھے ہوئے ہیں ابھی تک۔"

"مجھے دکھاؤ تو ماں!"

"کیا کرو گے اس وقت"

"تم دکھاؤ تو"

ساجدہ نے صندوق سے ایک پوٹلی نکال کر اس کی گود میں رکھ دی

توقیر کھول کر ٹٹولنے لگا۔

ہلکے گلابی رنگ کا ایک بشرٹ، اسی رنگ کا ایک تنگ پاجامہ، سرخ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بوٹ جن میں پاجامے سے میچ کرتی ہوئی جرابیں بھی تھیں۔ ایک سرخ رنگ کی خوبصورت جرسی اور اسی کلر کی —— ایک ٹوپی تھی۔ توقیر نے پوٹلی باندھی اور کھڑا ہو لیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

"مجھے میرے کمرے میں چھوڑ آؤ امی!"

ساجدہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

"یہ کپڑے یہیں رہنے دو بیٹا! کیا کرو گے تم؟"

توقیر نے پوٹلی بغل میں دے لی۔

"نہیں ماں رہنے دو میرے پاس ہی۔"

ساجدہ توقیر کو اس کے کمرے میں لائی اور بستر پر بٹھا کر باہر نکل گئی۔ توقیر لیٹ گیا اور کپڑوں کی گٹھڑی چھاتی پر رکھ کر نہ جانے کن سوچوں میں الجھ گیا۔

رات کا جلتا الاؤ ماند پڑ گیا تھا۔ چاند دور کہیں روپوش ہو کر انجانی منزلو
چکا تھا۔ ستارے جھلملانے لگے تھے۔ اور سپیدہ سحر کبھی کا نمودار ہو چکا تھا۔ تو
اسی طرح چھاتی پر کپڑوں کی گٹھری رکھے لیٹا ہوا تھا۔ پوری رات اُس نے جاگ کر کا
اندھیرا اب چھپنے لگا تھا۔ اور صبح کے نور کی کرنیں دھرتی کا منہ چومنے کو لپکنے لگی
کبھی کبھی کوئی پرندہ بھی اپنی مخصوص بولی میں بڑی دلجمعی کے ساتھ اپنے جاگ
کا پیغام دے رہا تھا۔ محلے میں کہیں کہیں دودھ دہانے کی آوازیں بھی آنے لگی
ایسے میں توقیر پلنگ سے اُترا اور ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر وہ کمرے سے باہر
برآمدے میں کھڑے ہو کر کان لگا کے کچھ سُننا چاہا۔ لیکن گھر میں سناٹا چھایا ہوا
شاید سب گھر والے ابھی تک سوئے ہوئے تھے۔ برآمدے سے اُتر کر دبے دبے

ہولے ہولے قدموں سے چلتے ہوئے اس نے صحن عبور کیا۔ اور دروازہ کھول کر گھر
سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر تک وہ اپنے اندازے کے مطابق ایک سمت چلتا رہا۔ لوگ اب
آہستہ آہستہ اُٹھنے لگے تھے۔ گھروں سے کھانسنے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔
سامنے کسی بس کے گزرنے کی آواز سنائی دی۔ توقیر کھڑا ہو گیا۔ شاید کوئی سڑک آگئی تھی
بس گزری تو سڑک پر کسی گھوڑے کی دُلکی چلنے کی آواز کانوں میں پڑی۔ کوئی تانگہ تھا اور
کوچوان اپنی دُھن میں مست گاتا جا رہا تھا۔

کِتنا بے درد یہ زمانہ ہے
بے گناہ ظلم کا نشانہ ہے

جھولی خوشیوں سے بھر کے لایا تھا
آج بے گھر ہے بے ٹھکانا ہے
کِتنا بے درد یہ زمانہ ہے

کوچوان گاتا جا رہا تھا۔
توقیر لبِ سڑک کھڑا ہو کر رونے لگا۔
تانگے والے کی آواز اور الفاظ نے اس کا دل جیسے کھینچ لیا تھا۔
وہ کھڑا ہو کے خوب رویا۔
تانگے والا گزر گیا وہ اُسے روکنا چاہتا تھا۔ لیکن اِسے تو اپنے آپ کا ہوش تک

نہ رہا تھا۔ آخر وہ سنبھلا۔ اپنی آستین سے آنکھیں صاف کرلیں۔

سورج چڑھ آیا تھا۔ پیچھے سے خطرہ بھی تھا کہ ساجدہ یا شہناز تعاقب میں آجائیں۔ لہٰذا وہ سڑک کے ساتھ ساتھ اندھا ہونے کے باوجود خاصی رفتار سے چلنے
اُسے کچھ خبر نہ رہی تھی کہ کون سی سڑک پر کس جگہ جا رہا ہے۔

بس ـــــ ایک اُمنگ تھی جو اُسے کھینچ رہی تھی۔

ایک جذبہ تھا جو اُسے بگولے کی طرح اُڑائے لے جا رہا تھا۔

ایک ایسی چاہت تھی جو دھندلی دھندلی امیدوں میں اُس کے دِل کو پتنگ کی طرح لہرا رہی تھی۔

بس جا رہا تھا سنبھلتا سنبھالتا۔

سڑک کے دوسرے کنارے سے ایک نوجوان کتابیں بغل میں دبائے کالج جا رہا تھا اور اپنا ہی گھڑا ہوا شعر ہولے ہولے گنگناتا جا رہا تھا۔

کون گلی تورا رین بسیرا

توقیر نے راستہ پوچھنے کی خاطر اُسے پکارا

”بابو!“

اس نے مڑکر بے رُخی سے کہا۔

کیا ہے تم اندھے صبح سویرے ہی مانگنا شروع کر دیتے ہو۔ کوئی اور کام ہے۔ ناک میں دم کر رکھا ہے تم جیسوں نے لوگوں کا۔ میرے پاس اس وقت دینے کو کچھ نہیں۔ تم لوگوں کا تو روز کا دھندا ہے یہ۔ کوئی کب تک تم جیسے طفیلیوں کا منہ بھ

رہے؟“

توقیر نے سماجت سے کہا۔

”تم غلط سمجھے ہو بابو! میں راستہ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”سیدھے تو جا رہے ہو“ خفگی سے اُس نے کہا۔

”نہیں۔ مجھے ریلوے روڈ کی طرف جانا تھا۔“

اس کالجیٹ کو شرارت سوجھی۔ ایسی عام سی شرارت جس کی بنا پر عام لوگوں میں کالج کے لڑکے بڑے چالاک اور ہوشیار سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً ایسے نہیں ہوتے۔ شرارتوں میں ہوں تو ہوں۔ مگر پڑھائی اور سلجھی باتوں میں عموماً کورے ہوتے ہیں

یہیں سے بائیں طرف مڑ جاؤ۔ سیدھے ریلوے روڈ پہنچ جاؤ گے۔ کالجیٹ صاحب نے فرمایا۔

توقیر اس کے کہنے پر جب بائیں جانب مڑا تو پانی کے ایک گڑھے میں گر گیا۔ گھٹنے گھٹنے پانی تھا۔ توقیر کی گرگابی کیچڑ میں لتھڑ گئی اور پاجامہ بھیگ گیا۔

کالج میں تعلیم کا ادب اور اخلاق سیکھنے کو جانے والے نوجوان نے خوش ہو کے قہقہہ بلند کیا۔ اپنی جگہ وہ بھی ٹھیک ہی ہوں گے۔ اُن کی شرارت جو پُوری ہو گئی تھی۔

اتنی دیر میں سائیکل سوار ایک بوڑھا آ گیا۔ اس کے لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کہیں چوکیدار ہو گا بچارہ۔ موقع پر پہنچ کر اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کر دی اور اس نوجوان کی طرف دیکھ کے کہا۔

”بہت بُرا کیا تم نے“

بوڑھا نیچے اُترا۔ توقیر کو پانی سے نکال کر سڑک پر لایا۔ اور پھر اس کالجیٹ پر گویا ا
ہی پڑا۔

یہی سیکھتے ہو کالج جا کے۔

یہ ہے تمہاری تعلیم۔

کالج والے تمہیں یہی اخلاق سکھاتے ہیں۔

تمہیں قوم کے مستقبل کے معمار ہو۔

تمہیں ہی لوگ ملک کے نونہال کہتے ہیں۔

کیا سب جوان تم ہی جیسے ہیں جن پر ملک کی ترقی اور خوشحالی کی بنیاد رکھی گئی
کالج اور اسکول کی چار دیواری یہی سکھاتی ہے کہ ایک اندھے بے بس اور مجبور
کو سیدھے راستے پر ڈالنے کے بجائے اُسے پانی کی کھڈ میں پھینک کر تم خوشی کے قہ
بلند کرو۔

تم جیسے جوان ڈوب مریں یا

یا —— کچھ کھا کے سو رہیں تو بہتر

بوڑھا اور گرم ہو گیا۔

کیا فائدہ بغل میں دبائی ہوئی تمہاری ان کتابوں کا۔

پھینک دو ان کو اس گندے نالے میں۔

کالجیٹ صاحب نے تلخی سے کہا۔

" بڑے آئے ناصح۔ ڈاڑھی نکالی ہوئی ہے بکرے کی طرح "

بوڑھے نے بھی ترکی بہ ترکی کہا۔

کل کو تم اپنے بوڑھے باپ کو بھی ایسے ہی کہو گے "

وہ نوجوان چیں بہ جبیں ہو کر آگے بڑھ گیا۔

توقیر پہلی بار بولا۔

چھوڑو بابا! اس کی عقل ہی اتنی تھی جتنی وہ دکھا گیا ہے۔ گدھا لات مارے تو اسے لات تھوڑی ماری جائے گی "

بوڑھا ابھی تک طیش میں تھا۔

" یہ تو گدھے سے بھی بدتر نکلا۔ راستہ نہیں بتا سکتے تو نہ سہی۔ شرارت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدانخواستہ اس کا کوئی بھائی اگر تمہاری طرح اندھا ہوتا اور اس سے کوئی دوسرا اس طرح کا مذاق کرتا تو پھر میں دیکھتا کیا گزرتی۔ اِس کوٹ پتلون والے کے دل پر انسان کو کوئی بھی حرکت کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیئے کہ اگر یہ مجھ پر گزرے تو میری حالت کیا ہوگی۔ بھوجی نہیں چاہتا کسی بے بس اور مجبور انسان کا دل دکھایا جائے۔

تمہاری باتیں بہت گہری ہیں بابا! سبھی انسان ایسا سوچنے لگیں تو دکھ درد کا نام ہی مٹ جائے "

" تم جاؤ گے کہاں بیٹا!

" ریلوے روڈ کی طرف ڈال دیں۔ آگے کالونی کی طرف جاؤں گا "

" آؤ بیٹھو میرے ساتھ میں تمہیں ریلوے روڈ کی طرف جانے والی چھوٹی سڑک پر ڈال دوں گا۔ میں تمہیں تمہارے گھر تک ہی چھوڑ آتا۔ لیکن ڈیوٹی سے لیٹ ہو جاؤں

گا پہلے ہی کافی دیر سے نکلا ہوں۔"

بوڑھے نے توقیر کو اپنے پیچھے سائیکل پر بٹھا لیا۔ اور ریلوے روڈ کو ملنے والی چھوٹی سڑک پر ڈال دیا۔ توقیر بغل میں بقچہ دبائے کافی دیر تک اس سڑک پر چلتا رہا۔ سورج اب کافی چڑھ آیا تھا۔ اس کے جوتوں، پاؤں اور پنڈلیوں پر کیچڑ اب سوکھ گئی تھی۔ پاجامہ ابھی تک گیلا ہی تھا۔

سڑک کے کنارے وہ چلا جا رہا تھا کہ اچانک وہ بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرا گیا۔ اس کی پیشانی پر چوٹ لگی اور خون بہنے لگا۔ گٹھڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی درد کی شدت سے وہ کراہ اٹھا۔

"اللہ ــــ" تھوڑی دیر وہ اپنا سر تھامے وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اپنی پوٹلی تلاش کرنے لگا۔ اس نے بڑی کوشش کی۔ لیکن گٹھڑی کہیں بھی اس کے ہاتھوں سے نہ ٹکرائی۔ بے حال وہ بڑبڑایا۔

یا اللہ! میری تو منزل زندگی اور خود اپنی ہستی کی شناخت ہے اس میں تو بڑا بے نیاز ہے پروردگار۔ میرے پاس کیا رہ گیا۔ لٹا ہوا ایک بے نوا مسافر ہوں۔

قریب سے چند برقع پوش عورتیں گزریں ان میں سے ایک بڑھیا نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

"کیا ڈھونڈھ رہے ہو بیٹا!"

توقیر نے لرزتی آواز میں کہا۔

"میری گٹھڑی یہیں کہیں گر گئی ہے۔"

گٹھڑی ایک طرف ڈھلان میں گر گئی تھی۔ بڑھیا نے اٹھا کر اسے دیدی۔ توقیر ٹھا اور پھر آگے بڑھنے لگا۔

بڑھیا نے دکھ سے کہا۔

"اندھا ہے بچارہ۔"

اس کے ساتھ والیوں میں ایک نے کہا۔

کتنا خوبصورت لڑکا ہے لیکن آنکھیں نہیں۔ اللہ توبہ۔"

بڑھیا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔

کیا گزرتی ہوگی بچارے کی ماں پر۔

عورتیں اسی طرح کی باتیں کرتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ توقیر آہستہ آہستہ چلتا ایک ڑک پر آیا۔ ٹریفک کا زور ہو گیا تھا۔ بے بس سا ہو کر وہ پکارا۔

"کوئی ہے؟"

قریب کھڑے ایک ٹھیلے والے نے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھائی؟"

توقیر نے منت کی۔

"ریلوے روڈ پر چڑھنا ہے بھیا۔"

"ٹھہرو!"

ٹھیلے والے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور چوک پار کرا کے وہ اسے ایک سڑک پر لے آیا۔

"لو یہ ہے ریلوے روڈ۔ آگے کہاں جاؤ گے؟"

"ریلوے کالونی کے پاس کریم پور محلہ ہے نا ایک۔"

"ہاں ہاں۔"

"وہاں جاؤں گا میں۔"

"بس پہنچ ہی گئے ہو۔ یہ نواب سٹریٹ ہے۔"

توقیر نے سکون سے کہا۔

"پھر تو فاصلہ تھوڑا ہی رہ گیا۔"

"ہاں۔ آئے کہاں سے ہو۔"

"دولت نگر سے چلا ہوں۔"

"پیدل آئے ہو۔"

"جی ہاں۔"

"بہت ہمت کی تم نے۔ اتنی لمبی مسافت طے کر آئے ہو۔ سڑک پر تم جیسے آدمی کا چلنا بڑا خطرناک ہے۔ ان سڑکوں پر ٹریفک کا بہت زور ہوتا ہے۔ تم نے کوئی ٹانگہ گاڑی ہی کر لی ہوتی۔"

"بس پیدل ہی چلا آیا ہوں بھائی۔ کیا کرتے ہو تم۔"

"ٹھیلا لگاتا ہوں سڑک پر۔"

"خدا تمہیں برکت دے۔"

ٹھیلے والے نے بڑی چاہت سے کہا۔

"ٹھہرو! میرے پاس دو روپے ہیں۔ تم لے جاؤ۔ میں تمہیں ٹانگہ کرا دیتا ہوں۔"

"نہیں بھائی۔ میں غریب ہوں۔ تم بھی غریب ہو۔ اور غریب پیدل چلتے اچھا لگتا ہے۔ یہ تمہارے بچوں کے کام آئیں گے۔ اور اس کی نسبت وہ صحیح مصرف ہے۔ میرا کیا ہے۔ میں عادی ہوں چلنے کا۔"

"ہچکچاؤ نا۔ لے لو۔ تمہارے طفیل خدا مجھے اور دے دے گا۔ یہی سمجھو تمہارا بڑا بھائی تمہیں دے رہا ہے۔"

توقیر بڑا متاثر ہوا۔

"میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ بھائی! یقین جانو۔ پیسے میرے پاس ہیں تم جاؤ اپنا دھندا کرو۔ میں اب چلا جاؤں گا۔ تمہاری مہربانی۔ آج کل کے دور میں تم جیسے انسان بہت کم ملتے ہیں۔" توقیر کی پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ جنھیں آستین سے اس نے صاف کرد۔

ٹھیلے والا چلا گیا۔

توقیر آگے بڑھ گیا۔

ریلوے روڈ پر وہ تھوڑی دیر ہی چلا تھا اور رک گیا۔ اب راستہ اس کا جانا پہچانا تھا سڑک پر چلتے ایک مرد سے اُس نے پوچھا۔

"کیوں بھائی! نہر کے کنارے کی چھوٹی پلی یہاں نزدیک ہی ہے کہیں۔"

"وہ مرد کوئی نیک طبع تھا۔ توقیر کی حالت پر رحم کھا گیا۔"

"وہ سامنے ہے اُدھر فرلانگ بھی نہیں یہاں سے کیا کرو گے وہاں۔"

" وہاں میں سڑک سے اتر کر کریم پور کو جاؤں گا۔"

" چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

پلی تک پہنچا دو بھیا۔ آگے میں چلا جاؤں گا۔ تمہاری بہت مہربانی۔"

وہ آدمی اُسے وہاں تک چھوڑ آیا۔

توقیر تھوڑی دیر سانس لینے کو پلی کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ گٹھڑی اُس نے بغل میں دبا رکھی تھی۔ جوتے، پاؤں اور پنڈلیوں پر اسی طرح کیچڑ جمی تھی۔ پیشانی سے ابھی تک خون رس رہا تھا اور کچھ وہیں جم سا گیا تھا۔ کچھ دیر وہ بیٹھا رہا۔ پھر آستین سے منہ صاف کرتا ہوا اُٹھا اور سڑک سے نیچے اُتر کر آبادی کی طرف ہو لیا۔

کوئی چھ مکانوں کے سامنے سے گزرنے کے بعد توقیر جمیلہ کے مکان کے پاس انداز لگا کے رکا اور دیوار ٹٹولتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ جونہی وہ اندر داخل ہوا دروازے کی چوکھٹ سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل اندر گر گیا۔ اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔

" ماں!"

کنول صحن میں نل پر بیٹھی برتن دھو رہی تھی۔ اس نے جب توقیر کو دیکھا۔

اُف خدایا۔

اس کا دل جیسے پھٹ گیا۔

ہاتھ میں پکڑی ہوئی پلیٹ فرش پر گر کر ٹوٹ گئی۔ اپنی جگہ سے وہ اُٹھی۔ بھاگ کر آگے بڑھی اور سہارا دے کر توقیر کو اٹھایا۔ جونہی اس کی نگاہ توقیر کی آنکھوں پر پڑی۔ الٰہی ـــــ ہلکی سی چیخ مار کے وہ پیچھے ہٹ گئی۔ جیسے بجلی کے تار کو اچانک چھو لیا ہو

توقیر کی حالت دیکھ کر وہ کانپ گئی۔

جوتوں اور پاؤں پر کیچڑ، بھیگا ہوا پاجامہ۔

پیشانی پر جما ہوا خون۔ اور اب دوبارہ گرنے سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ اور بغل میں ایک گٹھڑی۔

کنول پھر آگے بڑھی اور اس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑے۔

" یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے؟"

توقیر نے لگی ہوئی گرد اپنی آستین سے صاف کی۔

" کنول ہے!"

کنول رو پڑی۔

" ہاں!"

توقیر نے آنکھیں جھکالیں اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

کنول تڑپ گئی۔

" خدا کے لیے کچھ بتائیے کیا ہوگیا ہے آپ کو؟"

ضبط کرتے ہوئے توقیر نے کہا۔

مجھے اپنی امی کے پاس لے چلو کنول پھر بتاتا ہوں سب کچھ۔"

کنول اسے پکڑ کر کمرے میں لائی۔ اندر جمیلہ کے پاس پروین بیٹھی ہوئی تھی اور دونوں ماں بیٹی ہلکے ہلکے باتیں کر رہی تھیں۔ توقیر کو دیکھتے ہی پروین نے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں جانا چاہا۔ لیکن کنول نے ہاتھ کے اشارے سے اسے وہیں بیٹھنے کو کہا۔ توقیر کی

آنکھیں دیکھ کر وہ بیچاری بھی پریشان ہو گئی۔

جمیلہ، توقیر کو دیکھتے ہی خوش ہو گئی۔ لیکن

لیکن ——— جب اُس نے توقیر کی آنکھیں دیکھیں! اُوئی اللہ ج

رنگ سرسوں کی طرح پیلا پڑ گیا۔

"تمہاری آنکھیں کیا ہوئیں توقیر!" کانپتے ہوئے جمیلہ نے پُوچھا۔

کنول نے توقیر کو پلنگ کے سامنے ہی کرسی پر بٹھا دیا۔ توقیر نے کوئی جواب نہ

جمیلہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور اس کا شانہ ہلایا۔

"تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا بیٹا!"

توقیر نے سر جُھکا لیا اور رو پڑا۔

جمیلہ۔ کنول اور پروین تینوں بُری طرح رو دیں۔

توقیر زیادہ پھٹ پڑا۔

بالکل بچوں کی طرح وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

جمیلہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی۔

"مجھے کچھ بتاؤ تو سہی بیٹا! کس نے تمہاری یہ حالت بنائی ہے؟"

کنول برتن باہر چھوڑ کر وہیں بیٹھ گئی۔

توقیر کچھ کچھ سنبھلا۔

"زمانے نے میرا نور چھین لیا ہے ماں! کمر توڑ دی گئی ہے میری۔"

"کس نے ظلم کیا تم پر۔ منہ نوچ لوں گی میں اس کا۔"

غریب پر ہوتا ہوا ظلم بھی ماں تونگری کی سرزمین میں بسنے والوں کی تفننِ طبع کا
سامان سمجھا جاتا ہے۔ حالات نے مجھے کُتّے کی طرح دھتکار دیا ہے۔ میں بے بس کر دیا گیا
ہوں۔ کچل دیا گیا ہوں۔ اِس بھری دنیا میں نہ میرا کوئی باپ نہ ماں نہ بہن نہ بھائی کچھ
بھی نہیں رہا۔ کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔"

جمیلہ بیتاب ہو گئی۔

"کچھ کہو تو سہی نا بیٹا! کیا بیتی تم پر۔ مجھے زیادہ جستجو میں نہ ڈالو۔"

"میں بہت کچھ کہنے آیا ہوں ماں! بہت کچھ تم سُنو گی تو تھک جاؤ گی۔"

میں کہنے آیا ہوں۔

اس پھول کی کہانی جسے بے رحم گل چین نے شاخ سے توڑ کر کسی کے گلدستے کی زینت بنایا
اور اس بے درد زمانے نے اس کی خوشبو چھین لی۔ اور اس کی پتیاں مسل دیں۔

شبنم کے اس قطرے کی روداد جسے ہوا کے تیز جھونکے نے بہت جلد پھول کی
اس سے جدا کر کے ہوا میں تحلیل کر دیا۔

اس پتھر کا قصہ جو ساحل پر دوسرے پتھروں میں پڑا تھا۔ لیکن کسی ظالم نے اُٹھا کر
بے کراں موجوں میں پھینک دیا۔ ایک طویل عرصہ تک وہ سنگدل لہروں کے تھپیڑے
کھاتا رہا۔ آخر پانی کے تیز دھارے نے اسے بڑی بے دردی سے پھر ساحل پر پٹخ دیا۔

اس خشک پتے کا تذکرۂ حیات جو ڈال سے ٹوٹا اور پون اسے جگہ جگہ اُڑائے پھری
اس کی کوئی منزل تھی نہ کوئی مقصدِ حیات۔

اس جگنو کی کہانی کہنے آیا ہوں جو ایک طویل عرصہ تک کسی کا گھر روشن کرتا رہا آخر

نہ جانے بیداد گر زمانے نے اِسے کن گناہوں کی سزا دی۔ اس کا نور چھین لیا۔ اللہ

کی ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیا تاکہ اس کی ہستی ہی ختم ہو کر رہ جائے۔

ہاں اِسی جگنو کی کہانی ماں! جسے اپنے نور کی تلاش ہے۔

جو منزل کے لیے بھٹک رہا ہے۔

وہی ______ جسے ابھی تک کوئی ٹھکانا نہیں ملا۔

غم، دکھ اور درد کے بادو باراں کا طوفان سائے کی طرح تعاقب میں بھاگ

رہا ہے۔

وہ جس آشیانے کو اپنی منزل سمجھ کے آیا ہے وہ بھی اگر اس کی صحیح منزل نہ ہو

حوادث کے تیز طوفانوں کے بے رحم جھونکے اس کے پَروں کو توڑ موڑ کر کہیں دُور پھینک

گے۔ اور وہ بگولے کے اندر اُڑتی ہوئی خاک کی طرح بکھر کر رہ جائے گا۔ میں لوٹ لیا گیا

کچل دیا گیا ہوں۔

نہ منزل نہ مقصد۔

نہ اُمید نہ آرزو۔

کچھ نہیں رہا۔ کوئی بھی تو نہیں رہا میرا اس بھری دنیا میں۔

جمیلہ رو پڑی۔

اب پھٹ ہی پڑے ہو تو مجھ سے بھی سنو۔

جس دن تم مجھے لائنوں سے اٹھا کر لائے تھے میں ساری رات روتی رہی تھی۔

میرا دل کہتا تھا تم میرے بچھڑے ہوئے بیٹے ہو۔

میرا خون کہتا تھا تم پر احسان کرنے والا پرایا نہیں۔

میرے جسم کا سارا خون تمہیں دیکھتے ہی عجیب طرح سے کھول پڑتا ہے۔

تمہارا دکھ تکلیف اور غم میرے دل پر طوفان بن کر گزر جاتے ہیں۔ کچھ بتاؤ بیٹا!

بتا دو۔

تم کون ہو۔

تمہارا اصل نام ہے؟

کنول اور پروین سِسک سِسک کر رو دیں۔

فقیر بُری طرح ہچکیاں لینے لگا۔

ماں! میں جب تمہیں لائنوں سے اُٹھا کر لایا تھا تو

تو ______ تمہارے جسم کا لمس مجھے ہولے ہولے کچھ کہتا تھا۔

تمہارے دوپٹے کا آنچل میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر گزرے زمانے کی کئی

یادیں دکھا گیا تھا۔ لیکن اس وقت میں حالات میں اس قدر دبا ہوا تھا کہ کوئی تاثر

لے سکا۔

تمہارے جسم سے اس وقت بھی مجھے ممتا کے خون کی بُو آتی تھی لیکن

لیکن میں بدقسمت تھا ماں! بہت بڑا بدقسمت۔

جمیلہ چیخ پڑی

"سب کچھ ہی کہہ گئے ہو تو فقیر کی جگہ تو یہ کہہ کر ماں اور بیٹے کے درمیان سارے

پردے کیوں نہیں گرا دیتے" جمیلہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

میرا خون کہتا تھا تم پر احسان کرنے والا پرایا نہیں۔

میرے جسم کا سارا خون تمہیں دیکھتے ہی عجیب طرح سے کھول اٹھتا ہے۔

تمہارا دکھ، تکلیف اور غم میرے دل پر طوفان بن کر گزر جاتے ہیں۔ کچھ بتاؤ

بتادو

تم کون ہو۔

تمہارا اصل نام کیا ہے؟

کنول اور پروین سسک سسک کر رو دیں۔

توقیر بری طرح ہچکیاں لینے لگا۔

ماں! میں جب تمہیں لائنوں سے اٹھا کر لایا تھا تو

تو ــــ تمہارے جسم کا لمس مجھے ہولے ہولے کچھ کہتا تھا۔

تمہارے دوپٹے کا آنچل میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر گزرے زمانے کی
دکھا گیا تھا۔ لیکن اس وقت میں حالات میں اس قدر دبا ہوا تھا کہ جمیلہ نے جب
دیکھا تو تڑپ گئی چلا چلا اٹھی بیچاری۔

" ہائے میرے اللہ یہ تو میرے تنویر کے کپڑے ہیں جب وہ گم ہوا تھا یہی پہنے
ہوئے تھا"

وہی پاجامہ ہے۔

قمیض بھی وہی ہے۔

جرسی اور ٹوپی بھی وہی۔

اللہ ــــ اور یہ بوٹ جرابیں سبھی تو میرے تنویر کی چیزیں ہیں۔

پروین اب کھل کے رو دی۔

ماں نے اس نے بوٹ لے لیئے۔ اور والہانہ انداز میں انہیں چومنے لگی۔

توقیر آنکھیں جھکائے رو رہا تھا۔

جمیلہ نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"تم نے یہ کہاں سے لیے بیٹا"

توقیر چپ بیٹھا روتا رہا۔

جمیلہ نے اسے پوری قوت سے ہلا ڈالا۔

"کچھ بولو۔ خدا کے لیے کچھ کہو بیٹا"

توقیر نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔

" ماں! میری ان بے نور آنکھوں میں دیکھو۔ ان میں تمہیں آج سے اٹھارہ برس
پہلے کا ننھا تنویر نظر آئے گا۔ میں ہی تمہارا بدقسمت بیٹا ہوں جو زندگی بھر تمہارے کسی کام
نہ آسکا۔ زمانے نے جب مجھے تم سے ملایا تو آنکھیں چھین کر مجھے تم پر بوجھ بنا دیا۔ مجھے دیکھو
ماں! میرا نام توقیر نہیں تنویر ہے۔ میرے چہرے میں تمہیں بہت کچھ نظر آئے گا۔

جمیلہ بری طرح اس سے لپٹ گئی۔

میرا تنویر،

میرا بچہ،

میرا لال،

پروین کا دل چاہا اُٹھے اور اُٹھ کر اپنے چھوٹے بھائی کو گلے لگائے۔

لیکن ہائے۔

مجبوری اور بدقسمتی

اس کا ضمیر ایک تصویری روپ دھار کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

تم طوائف ہو۔

رنڈی ہو۔

رقاصہ اور جسم فروش ہو۔ کیوں اپنے معصوم بھائی پر اپنا ناپاک اور منحوس سایہ ڈ

پروین کی حالت۔

ہائے میرے پروردگار

اس کے جسم سے جیسے کسی نے سارا خون چوس لیا ہو۔ ٹسر ٹسر روتے ہوئے ا

اپنا سر کرسی کی پشت پر بُری طرح پٹخ دیا۔

کنول رو رو کے بدحال ہوئی جارہی تھی۔

دوسری طرف جمیلہ اور تنویر دونوں ماں بیٹا بھی رو رہے تھے۔

خوب رو رہے تھے۔

اپنی اپنی بدقسمتی پہ

جمیلہ آنسوؤں میں کہنے لگی۔

"تم نے مجھ مگوڑ ماری کو پہلے ہی دن کیوں نہ بتایا کہ تم ہی تنویر ہو؟"

تنویر اور زیادہ سختی کے ساتھ ماں سے لپٹ گیا اور کپکپاتی آواز میں کہا۔

"اس وقت مجھے کچھ علم نہ تھا۔ ماں کہ میں ہی تمہارا بدبخت بیٹا ہوں جس گھر میں میں رہتا تھا وہاں بار بار مجھے احساس ہوتا تھا کہ میرا خون کہیں دُور کھڑا مجھے پکار رہا ہے لیکن

لیکن ——— میں کچھ نہ کر پاتا تھا۔

کچھ سمجھ نہ سکتا تھا۔

مجھے اپنا بچپن یاد نہ تھا جو میں حالات کے خلاف بغاوت ہی کر بیٹھا۔

میں اس وقت سنبھلا جب زمانے نے مجھے سخت ٹھوکر لگا کر جھنجھوڑا۔

اس وقت ہوش میں آ کر میں بلبلا اُٹھا۔ جب تقدیر کے ... انہوں نے اپنی کند چھری میرے گلے پر رکھ دی۔

اپنے آنسو دوپٹے میں ضبط کرتے ہوئے جمیلہ نے تنویر کا مُنہ چوم لیا۔

اَب میں اپنے بچے کو کہیں نہ کھونے دوں گی۔

توقیر نے دُکھ سے کہا۔

میں اندھا ہو گیا ہوں ماں! مجھ سے بھی بڑھ کے کوئی بدقسمت ہوگا جو زندگی بھر اپنی بوڑھی اور بے بس ماں کی خوشی اور راحت کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا میں تو تم پر بوجھ بن گیا ہوں ماں۔ میری بھی کوئی زندگی ہے اب مر جاتا تو تم صبر کر کے چپ تو ہو رہتیں اس حالت میں میں تمہارے سامنے آ کر میں تمہارے لیے دائمی غم اور دکھ کا سامان بن کر رہ جاؤں گا ماں!

جمیلہ اور زیادہ نڈھال ہو گئی۔

بیٹا اندھا ہو یا دیکھنے والا ماں کے لیے اس کی آنکھوں کا نور اور مصیبتوں میں اس

کے لیے روشنی کا ایک روشن مینار ہوتا ہے۔ میں نے تمہارے انتظار میں اتنے برسا
جو دُکھوں کا زہر پیا ہے اس کا ——————
جمیلہ کی گرفت ختم ہو گئی اور تنویر کے ہاتھوں سے چھوٹ کر بستر پر گر گئی۔
تنویر بے تاب ہو کر پکار اُٹھا۔
"ماں!"
کنول اور پروین تڑپ کر اُٹھیں اور جمیلہ کو سنبھالنے لگیں۔ کنول نے نبض دیکھی،
اب کیا رکھا تھا ... جمیلہ تو ختم ہو چکی تھی۔
"کیا مصیبت آن پڑی تھی میرے اللہ"
کنول اور پروین زور زور سے رونے لگیں۔
تنویر گھبرا گیا۔ کنول سے اُس نے پوچھا۔
کیا ہوا امی کو کنول!"
کنول روتی رہی۔
تنویر کی بُری حالت ہو گئی۔
کچھ بولو کنول! میرا دل پھٹ جائے گا۔
کنول نے روتے ہوئے کہا۔
امی ہم سے رخصت ہو گئیں"
تنویر دھاڑیں مارنے لگا۔ کنول اور پروین کی چیخیں بھی لمحہ بہ لمحہ بلند ہونے لگ
حویلی کے سارے کمرے رونے دھونے کی آوازوں کی بازگشت سے گونج اُٹھے۔

اے دو جہاں کے مالک! انسان کو بھی تو نے کیا بنایا۔ محض پانی کا ایک بُلبلا؟ ایک
بیماری ماں بیٹے سے ملی اور ملنے ہی ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔

برجیس واقعی سب کچھ بھول کر اب راجو سے پیار کرنے لگی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا اصل روپ کیا ہے اسے اس مچھیرے سے پریت بڑھتی ہی چلی گئی تھی۔ توقیر نام کے کسی بھی شخص کے نقوش اس کے دل سے مٹ چکے تھے۔ ہاں اسے اس توقیر کی تلاش ضرور تھی۔ جسے اب تک اس کے شوہر کا درجہ حاصل تھا۔ وہ اس سے طلاق لے کر راجو کی طرف بڑھنا چاہتی تھی۔

راجو ——— جو اب اس کی منزل تھا۔

اسے محبت ہوگئی تھی۔

اس کی سنجیدگی اور آنکھوں کے گہراؤ سے

اس کی جفاکشی اور خوش اندامی سے۔

اس کی غربت اور سادگی سے،

بس ہوگئی۔

محبت کوئی پوچھ کے تھوڑا ہی ہوتی ہے یا کی جاتی ہے۔

بس آپ کسی کے لیے دل کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔

کچھ یہی حال برجیس کا بھی ہوگیا۔

لگاتار کئی روز تک بڑی محنت اور تگ و دو سے توقیر کو تلاش کرتی رہی تاکہ اس سے طلاق لے سکے۔ اس نے سارے بازار چھان مارے۔

سینما گھروں میں گئی۔

ساری سڑکیں گھوم ڈالیں۔

شہر کے محلے تک پھر لیے۔ پر توقیر کہیں بھی اسے نہ ملا۔ تنگ آکر ایک روز وہ اپنی قسمت پر خوب روئی کئی روز تک وہ بیمار پڑی رہی۔ کریمن لوا نے بڑی جانفشانی سے اس کی خدمت کی۔ آخر وہ سنبھل گئی۔ لیکن کافی کمزور ہو چکی تھی۔

ایک نئے ولولہ کے ساتھ آج وہ پھر گھر سے نکلی۔ کئی روز ہو چلے تھے اُس نے راجو کو نہ دیکھا تھا۔ پہلے وہ سیدھی مچھلی مارکیٹ گئی۔ کوئی دس کا وقت ہوگا غیاث اور مسعود اسی چھپّر تلے کھڑے مچھلی بیچ رہے تھے۔ راجو وہاں نہیں تھا۔ برجیس کچھ دل برداشتہ سی ہوگئی۔ آخر ہمت سے کام لیا اور آگے بڑھ کر مسعود سے کہا۔

آج تو آپ لوگوں کے پاس اچھی مچھلی نہیں۔" اس نے یونہی بات بنائی۔

مسعود نے بجھی سی طبیعت سے کہا۔

"بس یہی ہے جو ہے۔"

برجیس نے اور ہمت بڑھائی۔

"آپ کا دوسرا ساتھی کدھر گیا آج؟"

"کون؟"

"وہ ——— کیا نام تھا اس کا ——— ہاں راجو"

مسعود اُداس ہو گیا۔

"وہ تو دو ماہ ہوئے کبھی نہیں آیا۔"

"کیوں؟"

"اندھا ہو گیا ہے بچارہ"

برجیس کی جیسے جان ہی تو نکل گئی۔

"اندھا ہو گیا۔ وہ کیسے؟"

"اس کا اپنے بھائی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا۔ جس نے اس کی پیشانی لوہے کا ڈنڈا دے مارا۔ اور اس کی بینائی جاتی رہی۔ وہ بچارہ تو دو ماہ تک ہسپتال پڑا رہا۔ میں ہر روز اس کے پاس جاتا تھا۔"

"اتنا ظالم ہے اس کا بھائی؟"

حقیقتاً وہ اس کا بھائی نہ تھا۔ جس کے ہاں وہ رہتا تھا۔ انھیں یہ آج سے برس پہلے کسی گلی سے کسی کا کھویا ہوا بچہ ملا تھا۔ جس عورت نے اُسے پالا تھا وہ اُسے اپنے حقیقی بیٹے کی طرح چاہتی رہی۔ لیکن اس کا اپنا لڑکا اور اس کی بیوی

ہی اس سے نفرت کرتے رہے۔"

"اب وہ کہاں ہوتا ہے؟"

اس نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ اور پتہ نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ میں نے اُسے بہت تلاش کیا۔ لیکن کہیں نہیں ملا۔"

کیوں گھر کیوں چھوڑا اس نے؟"

"اسے پتہ چل گیا تھا کہ جسے وہ اپنی ماں سمجھے ہوئے تھا وہ اُس کی ماں نہیں اس کی بہن، بہن نہیں۔ اور بھائی اس کا بھائی نہیں۔ میں اس کے ہاں اب بھی جاتا رہتا ہوں۔ اس کی ماں ہر وقت روتی رہتی ہے۔ اور بہن اس کی جُدائی میں بیمار پڑ گئی ہے۔ گو ان دونوں کا اس سے کوئی حقیقی رشتہ نہیں۔ لیکن پھر بھی انھیں ایک بیٹے اور ایک بھائی کی سی محبت ہے۔"

تو کیا ابھی تک اس کا کوئی پتہ نہیں چلا؟"

"نہیں۔"

"مجھے اگر اس کی ماں سے ملنا ہو تو کہاں جاؤں؟"

"آپ دولت نگر چلی جائیے۔"

برجیس نے حیرت سے کہا۔

دولت نگر

جی ہاں۔

لیکن مجھے تو اس نے بتایا تھا کہ وہ مچھیروں کی بستی میں رہتا ہے۔ اور کسی مچھیرے

کی لڑکی سے اس کی منگنی بھی طے ہے۔

مسعود ذرا سا مسکرا دیا۔

اس نے آپ کو ٹالنے کی خاطر جھوٹ کہا ہوگا ورنہ مچھیروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ تو ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے یہ کام کر رہا تھا۔

کچھ پڑھا لکھا بھی ہوگا پھر

ہاں گریجویٹ ہے۔ بڑی مشکل سے پڑھا ہے۔ اس نے بیچارہ تصویریں بنا کر بازار بیچ کے اپنے اور اپنی بہن کے کالج کے اخراجات پورے کرتا تھا۔

برجیس جیسے چونک پڑی ہو۔

تصویریں بھی بنایا کرتا تھا وہ؟

جی ہاں۔

تو پھر میرا خیال ہے اس کا نام راجو بھی نہیں ہوگا۔

راجو تو اس بازار کے لوگ اسے پیار میں کہتے تھے۔ ورنہ اس کا نام توقیر ہے بلکہ یہ نام بھی اب ختم ہو گیا ہوگا۔

وہ کیسے؟

" اس کا نام توقیر تو ان لوگوں نے رکھا تھا جنہوں نے اس کی پرورش کی تھی ورنہ اس کے حقیقی ماں باپ نے اس کا نام تنویر رکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ وہ کپڑے بھی لے گیا ہے جو آج سے اٹھارہ برس پہلے وہ پہنے ہوئے تھا۔ انہی کپڑوں میں یہ چھوٹا سا بچہ انہیں بازار کی ایک گلی میں پڑا ملا تھا۔"

برجیس اُداس ہو گئی۔ بوجھل قدموں سے وہ اپنی کار کی طرف چل دی۔ راجو مچھیرا۔ جاگیردار توقیر اور مصور توقیر اب تینوں ہی روپ ایک ہستی میں آ کر اس کے دل میں محبت کی آگ کو اور تیز کر گئے تھے۔ توقیر کے ساتھ وہ اپنے ناروا سلوک پر شرمندہ ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے ذہن سے کئی لہریں اُٹھیں جو الفاظ کی شکل اختیار کر کے ہواؤں میں بکھر گئیں۔

توقیر

میرے اچھے توقیر کہاں ہو تم۔

اس کے دِل پر نشتر چل گئے تھے۔

غم اور دُکھ کے

طوفان چل گئے تھے۔

اُداس محبت کے غمگین جھونکوں کے۔

اُس کی سانس جان کی پھانس بن گئی۔

دُکھ کے گہرے دھوئیں میں۔

ہر سُو پھیلتی ہوئی تکلیف وہ حالات کی خلا میں۔

توقیر۔

جو اَب اس کی محبت کا محور اور مرکز تھا۔ اس کے لیے وہ سخت پریشان اور بےتاب ہوئی جا رہی تھی۔

اس کی ٹانگوں سے کسی نے قوت چھین لی تھی۔

اس کے دل پر گویا کوئی ہتھوڑے برسا گیا تھا۔

پگھل گئی تھی وہ

حالات کی جلتی بھٹی میں ۔

جلا ڈالا تھا اُسے

توقیر کے مختلف روپوں نے

لیکن اب

چہ چہ چہ

توقیر کے اصل حالات سُن کر وہ تڑپ اُٹھی تھی اور اس سے معافی مانگ

غلطیوں کی تلافی کر لینا چاہتی تھی۔ اس خیال کو دل میں لاتے ہوئے اُفتاں خیزا

پر آئی۔ اور کار کا دروازہ کھول کر وہ سیٹ پر گر سی گئی۔ اور دروازہ بند کر لیا۔

بے سُدھ ہو کر سیٹ کی پشت پر اُس نے سر ٹیک دیا اور بڑبڑانے لگی۔

الٰہی!

کِس امتحان میں ڈال دیا گیا ہے مجھے،

کِن گناہوں کے عذاب میں مُبتلا کر دی گئی ہوں میں۔

آخر اس نے کار سٹارٹ کی، اور کئی سڑکوں پر ہوتی ہوئی وہ ساجدہ کے ا

ہوئی۔

اس کا دل اس وقت تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اپنے متعلق کسی کو کیا بتائے گی۔

توقیر کے متعلق کیا پوچھے گی کسی سے۔

صحن میں جب وہ آئی تو گویا ساری ہی مشکل آسان ہو گئی۔ برآمدے میں اُسے ساجدہ نظر

تیزی سے آگے بڑھ کر اُس نے پوچھا۔

"بڑی بی تم یہاں"

ساجدہ نے پیار سے کہا

"یہ میرا گھر ہے بیٹی! تم کیسے بھول پڑیں آج"

برجیس حیرت زدہ ہو گئی۔

تمہارا گھر ہے؟ باہر ایک عورت سے میں نے توقیر کے گھر کا پتہ پوچھا تو اس نے

گھر بتایا"

ساجدہ نے دکھ سے کہا۔

"ہاں کبھی اس کا بھی یہی گھر تھا۔ لیکن اب پتہ نہیں کدھر کدھر کی ٹھوکریں کھا رہا

ہوگا"

"تو اس کا مطلب ہے توقیر کی پرورش تم نے ہی کی تھی"

"ہاں میں ہی وہ بدقسمت ہوں بیٹی"

"اس دن پارٹی کے روز تم نے پھر اس کا مجھ سے غلط تعارف کیوں کرایا"

ساجدہ رو پڑی۔

"کوئی ماں اپنے بیٹے کو سوسائٹی میں گرا ہوا نہیں دیکھنا چاہتی"

"لیکن تم نے میری زندگی برباد کر دی۔ میں نے بھائی جان کو اپنی شادی تصویریں

بنانے والے توقیر سے کرنے کو کہا تھا۔ میری شادی بھی بھائی جان نے اسی سے کی!
تمہارے الفاظ نے اسے میری نگاہوں میں قابلِ نفرت جاگیردار بنا دیا۔ اب تم ہی بتاؤ
ماں! میرا کیا قصور ہے۔ اس میں میرے ساتھ ——————

ساجدہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"توقیر نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا بیٹی! تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تقدیر
نے ہم دونوں کو غم کے اندھے کنوئیں میں آنکھیں باندھ کے پھینک دیا ہے توقیر
بغیر تو میری زندگی کے سارے گیت ادھورے رہ گئے ہیں۔ ذرا اندر چل کر دیکھ
بھائی کے بچھڑ جانے سے میری بیٹی کئی دنوں سے بخار میں جھلس رہی ہے۔ توقیر
کے چلے جانے سے تو ہم دونوں ماں بیٹی کی زندگی اُجڑ گئی ہے۔"

برجیس طیش میں آگئی۔

میں اس بھائی کی شکل دیکھنا چاہتی ہوں۔ جس نے توقیر کو بینائی سے محروم کر
میں اپنے شوہر پر اس ظلم کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کراؤں گی۔ ایک بار تو
مجھے مل جائے پھر بتاؤں گی ایک نیک دل انسان پر حیوانوں جیسا اتنا بڑا ظلم کس
کیا جاتا ہے۔"

ساجدہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔

"چھوڑو بیٹی! جو ہونا تھا ہو گیا۔ بات بڑھانے سے کیا حاصل۔"

دونوں شہناز کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ وہ تنویر کے بستر پر اداس لیٹی تھی۔
ساجدہ نے تعارف کرایا۔

شہناز! یہ برجیس ہے تمہارے بھائی کی برجیس۔"
شہناز تڑپ کر بولی۔
"بھابی! آپ کو بھیا ملے کہیں۔"
برجیس کی پلکیں بھیگ گئیں۔
"نہیں۔"
شہناز رونے لگی۔
کتنا سنگ دل ہے یہ زمانہ۔ ایک بھائی کو بہن سے جدا کر کے کس بیدردی سے
ستاتا ہے۔"

ساجدہ نے تکالیف دہ احساس سے کہا۔

"برجیس! یہی کمرہ ہے توقیر کا۔ وہ دیکھو اس کا وائلن پڑا ہے۔ شہناز ضد کر کے
اسے اپنی پسند کی دھنیں سنا کرتی تھی۔ اِدھر دیکھو تصویریں بنانے کی سکرین اور
یہ رنگ روغن پڑے ہیں۔ لیکن میرا بیٹا یہاں نہیں۔ خبر نہیں کہاں کھو گیا
ہے۔ سارا شہر چھان مارا ہے پر کچھ پتہ نہیں چلا۔"

برجیس سسک پڑی۔

"ماں! میں یہ ساری چیزیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

"لے جانا بیٹی۔ ضرور لے لینا۔ مجھے تو یہ سب چیزیں بیٹے کی یاد دلا دلا کے
رلاتی ہیں۔"

چند ساعتیں چپ رہیں۔ آخر ساجدہ کھڑی ہو گئی۔

"تم بیٹھو بیٹی! میں چائے لاتی ہوں۔"

مہ جبیں نے روکا۔

"کیوں تکلیف کرتی ہیں۔"

"تکلیف کاہے کی مہ جبیں! تمہیں اس گھر میں دیکھ کے تو میں محسوس کر رہی ہوں

گویا میرا توقیر لوٹ آیا ہے۔"

ساجدہ باہر نکل گئی۔ مہ جبیں بچاری شہناز کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

رات گزر چکی تھی۔ پو پھٹی اور نور کی سنہری کرنیں ہر سو کھلانے کو مچل مچل گئیں ایسے

ں دو پلنگ ساتھ ساتھ لگے تھے۔ ایک پر تنویر لیٹا تھا اور دوسرے پر کنول ہر چیز

، بےخبر سوئی پڑی تھی۔ تنویر شاید جاگ رہا تھا۔ ایک دو کروٹ بڑی پریشانی سے بدلی

ر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور جوتے پہن کر جب وہ دو قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ وہم سے سوئی

دی کنول پر گر گیا۔

کنول بوکھلا کر اٹھ بیٹھی

تنویر اس کی گود میں پڑا تھا۔ پیار سے اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا بات ہے تنویر!"

تنویر نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

"پانی پینے اُٹھا تھا گر گیا۔"

"مجھے کیوں آواز نہیں دی آپ نے؟"

کب تک قدم قدم پر تمہیں تکلیف دیتا رہوں گا۔

چاہت آمیز ڈانٹ سے کنول نے کہا۔

"پھر وہی مایوسی کی بات کی نا آپ نے،"

"تنویر نے آزردگی سے کہا۔

"بے بس اور مایوس ہو کر دیا گیا ہوں، کب تک تم میری لاٹھی بنی رہو گی!"

بہت جلد یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ میں نے آنکھوں کے ایک ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ اس نے کہا ہے آپریشن سے آپ کی آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ میرے پاس روپے ہیں۔ کچھ اور بنا لوں گی تو آپ کا آپریشن ہو جائے گا۔ پھر خدا نے چاہا تو آپ کو کسی لاٹھی کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

"اور اگر نہ ٹھیک ہوئیں پھر؟"

خفا ہو کر کنول نے مُنہ بسور لیا۔

"آپ کو تو ہر وقت اُلٹی باتیں ہی سُوجھتی ہیں۔ یہ بات بھی بھلا کہنے کی تھی؟"

"بس خفا ہو گئیں؟"

خود ہی تو خفا کرنے کی باتیں کرتے ہیں؟"

تنویر ہنس پڑا۔

"اچھا بابا! آئندہ نہیں کروں گا۔"

کنول اُٹھی تنویر کو سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھایا۔ اور قریب پڑی ہوئی کوری
سے پانی کا گلاس بھرا۔ پہلے اُسے کلی کرائی۔ پھر خود اپنے ہاتھوں سے اُسے پانی پلا
نویر پانی پی کے آستین سے مُنہ پونچھنے لگا۔

"کیا وقت ہوا ہو گا کنول!"

کنول نے گلاس صراحی پر رکھ دیا۔

"صبح ہو گئی ہے"

"پھر تو وقت پر ہی اُٹھ گئے ہم"

"ہاں، نہائیں گے یا ہاتھ مُنہ دُھلاؤں؟"

"نہاؤں گا۔"

کنول نے الگنی پر سے اس کے کپڑے اتار کر کندھے پر رکھے۔ قریب ہی ایک صاف ستھرا
ہوا تولیہ لے کر دوسرے کندے پر رکھا۔ برآمدے میں آ کر چلمچی کے پاس پڑی ہوئی
دانی اٹھائی پھر تنویر کے پاس آئی اور اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"اٹھیے نہا لیں۔"

تنویر کھڑا ہو گیا۔

کنول اسے سہارا دے کر غسل خانے میں لائی۔ کپڑے اور تولیہ اندر لٹکا دیے۔
دانی اس کے ہاتھ میں دی۔ اور خود باہر صحن میں نل پر آ کر ہاتھ مُنہ دھو کر وہ اندر
ئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال درست کیے۔ ربن باندھا، کپڑوں کی شکنیں دُور کیں
ہر آ کر سٹوو گرم کر کے چائے کے لیے پانی رکھ دیا۔ اتنے میں بیرونی دروازے پہ

دستک ہوئی۔ کنول نے باہر آکر دروازہ کھولا۔ دودھ والا تھا۔ ایک صاف ستھری پتیلی
کھنگال کے کنول نے دودھ لے لیا۔

اتنی دیر تک تنویر نہا چکا تھا۔ دروازہ کھول کے وہ ہلکے سے پکارا۔

"کنول!"

باورچی خانے میں دودھ کی پتیلی ڈھکنے کے بعد کنول غسل خانے کی طرف بھاگی

"آئی۔"

تنویر دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ نیا لباس پہن کے رات کا لباس اس
نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا۔ بڑا پیارا لگ رہا تھا وہ اس طرح کھڑا۔

کنول اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

"یہ کپڑے کیوں اٹھا رکھے ہیں آپ نے۔ اِدھر ہی پھینک دیں۔ دھو ڈالوں گی
آج۔"

"تین دن ہی تو پہنے ہیں اتنی جلدی میلے ہو گئے۔"

کنول ہنس دی۔

"آپ کو اس سے کیا دھونے تو میں نے ہیں نا۔"

تنویر نے کپڑے فرش پر پھینک دیئے۔

"یہ لو بھئی ناراض مت ہوا کرو۔"

کنول اُسے سہارا دے کر کمرے میں لائی۔ اچھی طرح تولیے سے اس کے بال خشک
کیئے۔ تیل لگایا اور کنگھی کر دی۔ پھر اس کے گالوں پر اپنے دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے

کہا۔

"شیو بھی ہونے والی ہے آج۔"

"کردو۔"

کنول نے سیفٹی نکالی پہلے صابن لگایا۔ پھر بلا جھجک کچھ اس طرح شیو کر دی جیسے
یہ اس کا روزمرہ کا کام ہو۔ شیو کر چکنے کے بعد کنول نے تولیے کا ایک پلو بھگو کر تنویر کا چہرہ
صاف کیا۔ اور کریم لگا کر بڑے پیار سے پوچھا۔

"بس؟"

تنویر نے اپنے مُنہ پر ہاتھ پھیرا۔

"اتنی اچھی شیو تو وہ سُسرا بازار والا نائی بھی نہ کر پاتا تھا۔ جتنے آرام اور سکون
سے یہ اپنا گھریلو نائی کرتا ہے۔"

کنول مُسکرا دی اور اس کا کان پکڑ کے کھینچا۔

"آپ مجھے نائی سمجھتے ہیں اپنا۔"

تنویر بھی موڈ میں تھا۔

"ہاں تو اور کیا۔ میرا نائی ہو۔ لاٹھی اور سہارا ہو۔ سبھی کچھ ہو۔ دوپٹے کے پو [illegible] جب شیو
کرتی ہو تو پتہ تک نہیں چلتا پتہ نہیں روزانہ بلیڈ تبدیل کرتی ہو۔"

کنول ہنس پڑی۔

"کہاں روزانہ تبدیل کرتی ہوں۔ ایک بلیڈ پورا مہینہ نکالتا ہے۔ پورے ایک ہفتے بعد
تو آپ کی شیو کہیں آتی ہے۔"

"چھوکرے سے تو ہیں آپ۔"

تنویر بھی ہنسنے لگا۔

"اچھا جی۔ تو میں چھوکرا ہوں؟

کنول نے شرارت سے کہا۔

"اور کیا"

"تو تم کون سی بڑی بی ہو ننھی منی گڑیا سی تو ہو۔"

"آپ سے دو ایک ماہ بڑی ہی ہوں گی"

"کیا تاریخ پیدائش ہے تمہاری؟"

"پہلے آپ بتائیں

"میں تو نومبر انچاس کی پیدائش ہوں۔"

"پھر تو آپ مجھ سے چار ماہ چھوٹے نکلے ہیں جولائی انچاس کی پیدائش ہوں۔"

جھوٹ

ہنس دی۔

آپ کو اس سے کیا۔ نہیں۔ اچھا ٹھہریں میں میٹرک کا سرٹفکیٹ دکھاتی ہوں

آپ کو۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ایک بکس سے کنول سرٹیفکیٹ نکال لائی اور بڑی

شوخی اور پیار سے تنویر کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

خود دیکھ لیجئے تاریخ پیدائش۔

تنویر اداس ہو گیا۔

میری آنکھیں ہی نہیں دیکھوں گا کیا۔

کنول کی حالت ایسی ہو گئی۔ گویا کسی نے جان ہی نکال لی ہو۔ بڑے دکھ سے

اس نے کہا۔

معاف کر دیجئے مجھے خیال نہیں رہا تھا۔

تنویر اپنے امنڈتے ہوئے آنسو پی گیا۔

معافی مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ جب ہوا ہی اندھا تو کسی سے شکایت کیوں۔

کنول پگھل گئی۔

رنگ فق ہو گیا۔

پورا جسم کانپ گیا۔

کچھ سوچ کے کنول اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنے شانے سے لگاتے

ہوئے دکھ میں ہکلاتے ہوئے کہا۔

"معاف کر دیجئے مجھ سے غلطی ہوئی۔

تنویر بیچارہ رو دیا۔

کنول اپنے امڈتے ہوئے آنسو پی گئی۔ اور اپنے دوپٹے کے پلو سے تنویر کے آنسو

پونچھتی ہوئی بیچاری خود بھی پھٹ پڑی۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے اور وہ تنویر

کی چھاتی پر اپنا سر رکھ کر بری طرح سسک سسک رونے لگی۔

تنویر بیچارہ پچکار پچکار کر اسے تسلی دینے لگا۔

باہر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کنول جلدی جلدی باہر نکلی۔ پر وہیں آئی تھی وہ

صحن عبور کر کے برآمدے میں داخل ہو رہی تھی۔ کنول نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"بہت سویرے آگئی ہو باجی!"

پروین نے غمگین لہجے میں کہا۔

پوری رات چین سے نہیں کاٹی۔ ہر وقت بس تنویر کی طرف ہی خیال رہا۔ کہاں ہے اس وقت۔"

اندر ہیں۔ غسل کرایا ہے۔ کنگھی کر کے شیو بنائی ہے اور ابھی کرسی پر بٹھا کے آئی ہوں۔"

پروین نے اُداس ہو کے کہا۔

اور تم دونوں رو بھی رہے تھے۔

نہیں تو۔

جھوٹ۔ میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی تم دونوں کی سسکیاں سنی تھیں۔ اس کے علاوہ تمہاری آنکھیں بھی اس کے علاوہ تمہاری آنکھیں بھی اس کے متعلق بہت کچھ کہہ رہی ہیں۔

کنول نے سر جھکا لیا۔

پہلے وہ روئے تھے اور ساتھ مجھے بھی رُلا دیا۔

پروین رو پڑی۔

میں بھی کتنی بدقسمت ہوں کنول! بھائی کے قریب ہوتے ہوئے میں اس سے بات نہیں کر سکتی۔ اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی۔ اور ——— اور نہ ہی اُسے بھائی کہہ کر پکا

تی ہوں۔ کوئی یہ بھی زندگی ہے موت دے دیتا تو اس حالت سے بہتر تھی۔

کنول نے اسے ڈھارس دی۔

چپ ہو جاؤ آپا۔ مقدر کی لکیریں کون مٹا سکتا ہے۔

کنول اسے کھینچ کر باورچی خانہ میں لے آئی۔

تم ذرا بیٹھو آپا میں انہیں سگریٹ سلگا کے دے آؤں۔ اس وقت وہ روز سگریٹ لیتے ہیں۔

کنول اندر آئی۔ اپنے سنگار میز پر پڑے ہوئے ریڈ اینڈ وائٹ کے پیکٹ سے گریٹ نکالا۔ ماچس سے اسے سلگایا۔ ہلکا سا ایک کش لگایا۔ کھانستی ہوئی تنویر کے س آئی اور سگریٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

"آپ سگریٹ پئیں۔ اتنی دیر تک میں آتی ہوں۔"

"میں نے کہاں جانا ہے۔ ناشتہ تیار کر لوں اور ابھی آتی ہوں۔

کنول باورچی خانے میں آئی۔ پروین ابھی تک بیٹھی رو رہی تھی۔

کنول اس کے پاس آ بیٹھی۔

" رو رہی ہو آپا۔ کب تک یہ حالت بنائے رکھو گی۔

پروین پھٹ پڑی۔

میں بھائی سے دُور نہیں رہ سکتی۔

اس کے سامنے چلی جاؤں گی آج۔

آج میں باتیں کروں گی اپنے بھائی سے۔

اُس کا دُکھ باٹوں گی۔

اپنی بدحالی کہوں گی۔

سب کچھ کہہ دوں گی آج۔

کنول نے حیرت کا اظہار کیا۔

اپنے متعلق سب کچھ بتا دوں گی انہیں۔

میں پروین بن کے نہیں کسی اور روپ میں بھائی کے سامنے جاؤں گی، اس سے
کرکے اپنے بکھرے ہوئے ذہن کے لیے سکون کرونگی۔

کیسے جاؤ گی اُن کے سامنے "

پروین کھڑی ہو گئی۔

نہیں تم دیکھتی جاؤ "

پروین اندر چلی گئی اور کنول ناشتہ تیار کرنے کے ساتھ اُن کی باتیں سننے کی بھی کوشش
کرنے لگی۔

پروین سلام کہتی ہوئی تنویر کے سامنے بیٹھ گئی۔

تنویر نے سلام کا جواب دیا اور حیرت سے پوچھا۔

کون ہیں آپ۔ میں نے پہچانا انہیں آپ کو "

پروین نے حاضر جوابی سے کہا۔

" میں آپ کے ہمسائے کی لڑکی عاصیہ ہوں "

" پہلے کبھی میں نے تمہیں یہاں نہیں دیکھا "

" میں تو نہیں ہوتی تھی۔ آپ خود کبھی کبھی یہاں آتے تھے۔ آپ کی ماں نے مجھے
اپنی بیٹی بنایا تھا۔ جس دن وہ فوت ہوئی تھیں اس وقت میں اُن کے پاس تھی "

ہاں میں نے آپ کے رونے کی آواز تو سُنی تھی لیکن ماں نے مجھے کبھی آپ کے متعلق
کچھ بتایا نہ تھا "

" آپ اکیلے پڑے پڑے گھبرا نہیں جاتے "

" کنول جو ہے میرے پاس۔

اچھی لڑکی ہے کنول۔ پھر بھی آپ اُداس تو ہو ہی جاتے ہوں گے "

اُداسی اور غم قسمت میں جب لکھے ہی گئے ہیں تو شکایت کیا کریں۔ زندگی میں
افسردگیوں کے علاوہ اب رہ بھی کیا گیا ہے۔

نہ ماں نہ باپ۔

نہ بھائی نہ بہن۔ زندگی کے سارے گیت ادھورے رہ گئے ہیں۔

کوئی بھی تو نہیں میرا اس دنیا میں۔ کتنا شوم قدم اور بدنصیب ہوں میں۔

" مجھے آپ کی حالت دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے۔ کاش میری بھی آپ جیسی کوئی
بہن ہوتی "

" آپ مجھے اپنی ہی بہن سمجھیں "

" تمہیں بہن کہہ کر مجھے بے حد خوشی ہو گی "

" میں نے آپ کی امّی سے سُنا تھا۔ پروین نام کی آپ کی کوئی بہن ہے "

" ہے تو لیکن "

لیکن اِس سنگدل زمانے نے اسے اس بازار پہنچا دیا ۔

جہاں ——— ایک عزت مند بھائی اُسے بہن نہیں کہہ سکتا ۔

ایک شریف باپ اُسے بیٹی کہہ کر نہیں پکار سکتا ۔

اور ایک پاک دامن ماں اِسے ۔

اُسے اپنی بیٹی نہیں کہہ سکتی ۔

تنویر کی پلکیں بھیگ گئیں ۔

پروین رو پڑی ۔

"لیکن اِس بیچاری کا کیا دوش ؟"

"قصور اس کا تو نہیں ۔ اس وقت کا ہے جس منحوس وقت وہ وہاں پہنچائی گئی تھی"

"معاشرے کے ان سیاہ ہاتھوں کا قصور ہے جنھوں نے کسی کی معصوم اور بے داغ بچی کو اٹھا کر اس بازار لا بٹھایا ۔ جہاں کسی کو دین و دنیا کی روسیاہی کے سوا کچھ نہیں ملتا!"

اِن مردوں کا گناہ ہے جو کسی کی لڑکیوں پر اتنے گھناؤنے ظلم ڈھاتے ہیں ۔

باورچی خانے میں بیٹھی کنول بھی رو رہی تھی ۔

پروین نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ۔

"کتنی بد قسمت ہے آپ کی بہن ؟"

"ہم دونوں ہی بدنصیب ہیں ۔ نہ وہ مجھے مل سکتی ہے نہ میں اُسے مل سکتا ہوں"

نہ وہ مجھے بھائی کہہ سکتی ہے نہ ہی میں اُسے بہن کہہ کر پکار سکتا ہوں ۔

تنویر نے اس موضوع سے چھٹکارا چاہا ۔

"تمہارا کوئی بھائی نہیں"

"ایک ہے"

"کیا کرتا ہے"

"کچھ بھی نہیں"

"کیوں ؟"

"اندھا ہے"

"تنویر نے حیرت سے پوچھا"

"اندھا ہے"

"جی ہاں"

"کیا ہوا ہے"

"ایک حادثے میں آنکھیں جاتی رہیں"

"میری طرح تم بھی بد قسمت ہی ہو"

"پروین بُری طرح رو دی ۔

"ہاں بھیا ! ہم دونوں ہی بد بخت ہیں"

کنول ناشتہ لے آئی ۔ دونوں نے اپنے اپنے آنسو پونچھ لیے کنول نے دونوں کے درمیان میز رکھا اور ناشتہ لگا دیا ۔ اور پھر وہ دونوں خود کھانے کے ساتھ ساتھ تنویر کو بھی کھلانے لگیں ۔

کنول کا آج ایم بی بی ایس کا رزلٹ نکلنا تھا۔ صبح سویرے ہی اُٹھ کے اُس نے
کا منہ دھلایا۔ اُس کے ساتھ بیٹھ کے ناشتہ کیا۔ آج اس کی شیو بھی نکلتے اُسے کوئی چ
یاد آ گئی۔ واپس مڑی اور ایک سگریٹ سلگا کر تنویر کو تھماتے ہوئے کہا۔

"مَیں ابھی آئی۔ رزلٹ دیکھ آؤں۔"

تنویر نے بیتابی سے کہا۔

"جلدی آنا۔"

"بس ابھی کے ابھی آئی۔ اخبار یہیں لے آؤں گی تھوڑی دیر تک بھی آجائے گی
کے پاس بہت اچھی لڑکی ہے بچاری۔ ہر روز آپ کو دیکھنے آتی ہے۔ سگے بھائی کی
چاہتی ہے آپ کو۔"

عاصیہ کا نام سُن کر تنویر کے چہرے پر بشاشت پھیل گئی۔

"ہاں! بہت اچھی لڑکی ہے۔ بچاری کی باتوں سے دکھ اور غم ٹپکتا ہے۔"

"بہت دُکھ دیئے ہیں زمانے نے اِسے۔ نہ ماں نہ باپ۔ بس ایک اندھا بھائی ہے۔
اسی کے لیے جی رہی ہے ورنہ ابھی تک خودکشی کر چکی ہوتی۔"

"بالکل میرے جیسے حالات ہیں اس کے۔"

"ہاں۔ تبھی تو وہ آپ کو ایک بہن کی طرح چاہتی ہے۔" باہر نکلتے ہوئے کنول نے کہا۔

"اچھا میں چلی۔"

"جاؤ۔"

کنول کو باہر گئے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ تنویر بھی اُٹھا۔ ٹٹول ٹٹول کے سب
روں کو زنجیریں لگائیں۔ پھر صحن عبور کر کے باہر آیا۔ بیرونی دروازے کی کنڈی لگا کے
وئے ہوئے چلتا سڑک کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ چند ساعتوں بعد ایک طرف سے رکشا
آواز سُنائی دی۔ ہاتھ کے اشارے سے تنویر نے اسے روکا۔ اور اس میں بیٹھ کر
یدھا شاکر کی دوکان میں جا داخل ہوا۔

تنویر کو دیکھ کر شاکر بڑا خوش ہوا۔ اس کا بازو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔ اور ہمدردی کے
ے میں کہا۔ "تمہاری آنکھیں ضائع ہو جانے کا سخت افسوس ہے۔ توقیر بڑا ظالم انسان
ا جس نے تم پر اس طرح ہاتھ اٹھایا۔" تنویر ٹال گیا۔

"زمانے میں آئے دن ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ کو کیسے پتہ چل گیا۔"

"مجھے تو اس لڑکی نے بتایا جو تمہاری تصویریں لے جایا کرتی تھی۔"

تنویر حیرت زدہ سا ہو گیا۔

"اُسے کس نے بتایا؟"

بس کہیں سے لگا لیا ہوگا پتہ اس نے بھی۔ وہ تمہاری تصویریں بھی ساری خرید
کے لے گئی ہے۔ تمہارے لیے بڑی پریشان ہے۔ وہ بچاری تقریباً ہر روز ہی یہاں
تمہارا پوچھتی ہے۔"

"میں بھی اسی لیے آج آیا ہوں۔ کچھ روپے چاہئیں مجھے۔"

"تمہارا میرے پاس اڑھائی سو روپیہ ہے ٹھہرو۔"

شاکر نے جیب سے روپے نکالے۔

"یہ لو۔"

تنویر نے لے کر مٹھی میں دبا لیے۔

"ذرا بیٹھنا میں ہوٹل والے کو چائے کا کہہ آؤں۔"

تنویر کھڑا ہو گیا۔

"نہیں بھیا! رہنے دو۔ پھر کبھی پیوں گا۔ اس وقت مجھے جلدی ہے۔"

"صرف پانچ منٹ۔"

"نہیں بھائی مہربانی۔ آپ یہ بتائیں آج کا اخبار ہے۔ آپ کے پاس؟"

"ہاں ہے۔"

"ایم بی بی ایس کا رزلٹ ہے اس میں؟"

"رزلٹ تو آیا ہے آج۔ کسی کا نمبر دیکھنا ہے۔"

ہاں! ذرا دیکھئے تو رول نمبر۔ پچاسی کا کیا ہوا؟"

شاکر نے اخبار الٹ پلٹ کے دیکھا۔

پاس ہے۔"

شکر ہے۔ اچھا بھیا میں چلا۔ پھر آؤں گا کبھی۔"

تنویر کو دوکان سے نکلے تھوڑی دیر گزری تھی کہ رجبیں وہاں آ گئی اور آتے ہی
اکر سے پوچھا۔

توقیر آیا بھائی صاحب ادھر؟"

شاکر کھڑا ہو گیا۔"

ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔ روپے لینے آیا تھا۔ بچارہ کہہ رہا تھا۔ سخت ضرورت
ہے۔

"کس طرف گیا ہے؟"

"دائیں ہاتھ کو نکلا ہے۔ بمشکل چوک کے پاس پہنچا ہوگا ابھی۔"

"پیدل گیا ہے نا۔"

"ہاں ہاں۔"

رجبیں جلدی جلدی باہر آئی۔ اور کار میں بڑی تیزی سے اس کا تعاقب کرنے لگی۔
ل کے قریب ہی اُسے تنویر جاتا ہوا مل گیا۔ سڑک کے ایک طرف اُس نے کار روکی اور
یر کے قریب آتے ہوئے اُسے پکارا۔

"توقیر!"

تنویر اپنا پُرانا نام سن کر رُک گیا۔

برجیس قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"کئی ماہ سے آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ آج ملے ہیں"

تنویر نے اچنبھے پن سے پُوچھا۔

"میں نے آپ کو پہچانا نہیں"

پہچانے جانے کے خوف سے برجیس نے جھٹ جھوٹ بول دیا۔

"میرا نام کوثر ہے۔ تصویروں کی دوکان کے مالک شاکر نے میرے متعلق آپ کو شاید
بہت کچھ بتا دیا ہوگا"

تنویر مُسکرا دیا۔

"او سمجھا۔ آپ میری تصویریں خریدنے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ میں بہت مشکور ہوں
آپ کا۔ شاکر نے مجھے کئی بار آپ کے متعلق بتایا۔ لیکن میں چند مجبوریوں کے باعث آپ سے
ملاقات نہ کر سکا۔ مجھ سے کام ہے کوئی؟

"جی ہاں۔ آپ ذرا میرے ساتھ چلیئے"

تنویر نے ٹالنا چاہا۔

"میں نے ذرا جلدی جانا ہے۔ وہ ایک چیزیں بھی خریدنا ہیں مجھے"

"میں آپ کو چھوڑ آؤں گی"

برجیس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سڑک پار کرا کے کار میں بٹھایا اور گھر لے آئی کریمن بوا
نے اُسے دیکھتے ہی کچھ کہنا چاہا۔ لیکن برجیس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے چپ رہنے

اور تنویر کو اپنے کمرے میں لا بٹھانے کے بعد وہ باہر آئی اور کریمن بوا کو چائے بنانے
کہا۔ کریمن بیچاری ابھی تک ایک جستجو میں ہی کھڑی تھی۔ آخر پوچھ ہی پڑی۔

وہی ہیں یا کوئی اور ہے بیٹی"

برجیس ہنس دی اور دھیرے سے کہا۔

جس توقیر سے میری شادی ہوئی تھی وہ تصویریں بنانے والا توقیر اور مچھلیاں پکڑنے
تینوں ایک ہی فرد ہیں جو ابھی اندر بیٹھے ہوئے ہیں"

کریمن بوا ہاتھ ملنے لگی۔

ہائے تو یہ ہم سے جھوٹ ہی کہتے رہے"

مجھ سے ناراض جو تھے اس وجہ سے اپنے آپ کو چھپاتے رہے۔ تم ان کے سامنے بات
کہیں وہ تمہاری آواز ہی نہ پہچان لیں۔ میں نے بھی انہیں اپنا نام کوثر بتایا
جلدی جلدی چائے کے ساتھ کچھ کھانے کی چیزیں بھی اندر لاؤ۔ میں جا کر ان کے
تی ہوں"

برجیس آ کر تنویر کے پاس بیٹھ گئی۔

میں ایک بار آپ کے پرانے گھر گئی تھی۔ لیکن اس وقت آپ کے ساتھ آنکھوں
پیش آ چکا تھا۔ اور آپ اس گھر کو چھوڑ چکے تھے۔ آپ کے حالات سُن کر مجھے بڑا
بڑا ظالم تھا آپ کا بھائی"

تنویر رنجیدہ ہو گیا۔

جس کا کوئی چارہ گر اور غمگسار نہ ہوں اس کی حالت ایسی ہی ہوتی ہے"

"آج کل آپ رہ کہاں رہے ہیں؟"

"کریم آباد"

"کس کے پاس؟"

"مجھے میری اصل ماں مل گئی تھی۔ اور اب میں اپنے آبائی مکان میں رہ رہا ہوں۔ پہلے بھی اُن کے پاس جاتا رہتا تھا لیکن ماں بیٹا ہونے کا بھید بعد میں کھُلا۔"

برجیس خوش ہو گئی۔

"آپ کی امی مل گئیں۔"

تنویر افسردہ ہو گیا۔

ملی تھیں لیکن وہ بیمار تھیں۔ جس دن ہم دونوں ماں بیٹے کی ملاقات ہوئی۔ اس دن میری ماں اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ گئیں۔ آج سے اٹھارہ برس پہلے انہوں نے کسی کی گم شدہ بچی کو پالا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو ماں اور بیٹی کی طرح چاہتی تھیں۔ میں اب اسی کے پاس رہ رہا ہوں۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"کنول!"

"بڑا پیارا نام ہے۔ کیا کرتی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں کرتی۔ اس سال ایم بی بی ایس کا امتحان دیا تھا۔ آج رزلٹ نکلا ہے اور پاس ہو گئی ہے۔ میں اسے ہی کوئی چیز خرید کر تحفہ میں دینے کے لیے نکلا تھا۔"

"برجیس اُداس ہو گئی۔"

"شادی کر لی ہو گی اس سے؟"

"نہیں۔"

کریم بُوا چائے رکھ گئی۔ اور برجیس چائے کے ساتھ جملہ لوازمات بھی تنویر کو کھلانے لگی۔

محبت تو ہو گی ہی اس سے؟

تنویر ٹال گیا۔

بس ـــــ

تحفہ میں کیا دیں گے اسے۔

تنویر نے اپنی مٹھی کھول دی۔

میرے پاس یہ اڑھائی سو روپے ہیں۔ شاکر سے لیے ہیں آج۔ ڈیڑھ سو میں اس کے لیے میں ایک ساڑھی۔ ایک بلوز۔ ایک جوتا اور محلے میں بانٹنے کو کچھ مٹھائی خریدنا چاہتا ہوں۔ باقی ماندہ سو روپیہ اسے نقد دوں گا۔

برجیس نے ڈرتے ڈرتے اور کانپتے کانپتے نیا موضوع چھیڑا۔

میں جب آپ کے گھر گئی تو آپ کی امی نے بتایا تھا کہ آپ نے پچھلے برس کسی لڑکی سے شادی کی تھی۔ انہوں نے مجھے اس لڑکی کا نام بھی بتایا تھا۔ بھلا سا نام تھا ـــــ ہاں خوب یاد آیا برجیس۔ کیا یہ سچ ہے۔

تنویر کے چہرے پر بیزاری سی پھیل گئی۔

ہے تو سچ۔

پھر آپ نے اِسے چھوڑ کیوں دیا۔

میں نے تھوڑا ہی چھوڑا تھا اُسے ۔

"پھر؟"

" اُلٹا اُس نے مجھے چھوڑا۔ وہ کوئی مغرور اور امارت پسند لڑکی تھی۔ میں تو اس سے شادی پر رضامند ہی نہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کا بھائی میرا بڑا اچھا دوست تھا۔ اُس نے مجھے شادی پر مجبور کر دیا تھا۔ ورنہ میں تو شروع سے ہی ـــــ"

برجیس نے بات پوری کر دی ۔

"کنول کو چاہتے ہوں گے ۔"

تنویر چپ رہا۔

برجیس نے غمگین لہجہ میں پوچھا ۔

" برجیس کو آپ نے طلاق دے دی ہے کیا؟"

" ابھی تو نہیں۔ دے تو دینی تھی مگر میرے حالات ہی کچھ پیچیدہ سے ہو گئے تھے۔ اب کنول نے کہا ہے میری آنکھیں آپریشن سے ٹھیک ہو جائیں گی۔ خدا نے اگر چاہا اور میری بینائی مجھے واپس مِل گئی تو پہلی ہی فرصت میں اسے طلاق دے کر فارغ کر دوں گا ۔"

برجیس اور غمزدہ ہو گئی۔

" بہت بیزار دکھائی دیتے ہیں اِس سے ۔"

" اور کیا کروں۔ میرے ساتھ اُس نے سلوک ہی ایسا کیا ہے ۔"

" بہت بد بخت تھی جس نے آپ جیسے شوہر کو چھوڑ دیا۔"

" پتہ نہیں وہ بد بخت تھی یا میری ہی قسمت کے سکے کھوٹے تھے جو ہم آپس میں نباہ نہ کر سکے۔ اس کا بھائی بیچارہ بڑا اچھا اور سلجھی طبیعت کا تھا۔ ظاہراً وہ بھی اچھی دکھائی دیتی تھی۔ خوبصورتی اور شخصیت میں بھی کمال تھی لیکن خو کی خود پسند تھی۔"

برجیس سنتی رہی اور آنسو بہاتی رہی ۔

تنویر پھر بولا ۔

مجھے اب چلنا چاہیئے۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

برجیس کھڑی ہو گئی ۔

" پہلے بازار چلیں گے نا۔"

"ہاں۔"

تنویر کا ہاتھ پکڑ کر وہ باہر لائی اور دونوں بازار چلے گئے۔ تنویر نے اُسے ڈیڑھ سو روپیہ دے دیا اور سو اپنے پاس رکھ لیے۔ برجیس نے اپنے پاس سے روپے ڈال کر۔

ایک نیلے رنگ کی بھاری پلّو کی بنارسی ساڑھی۔ خاصی قیمتی تھی۔

اسی رنگ کا ایک خوبصورت بلوز،

ایک قیمتی جوتا،

اور پانچ سیر مٹھائی خریدی۔

تنویر موٹی موٹی جگہوں کی برجیس کو نشاندہی کرتا رہا۔ اس طرح دونوں کریم آباد پہنچ گئے۔ برجیس نے کار مکان کے باہر کھڑی کی۔ سارا سامان تنویر نے اُٹھا رکھا تھا اور وہ

بیچاری کانپتے دل کے ساتھ، ہچکچاتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے مکان میں داخل ہوئی۔

کنول اور پروین اندر بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔

تنویر کو دیکھتے ہی برجیس کا خیال کیے بغیر کنول نے خفا ہو کے کہا۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے تو ہم لوگ پریشان ہو گئے ہیں۔ اکیلے بازار جانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی آپ کو۔ کہیں خدا نہ کرے گر پڑتے پھر"

تنویر نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور پہلے برجیس سے ان کا تعارف کرایا۔

"عاصیہ یہیں ہے۔"

"ہاں؟"

"اچھا پھر تم دونوں ان سے ملو۔ اُن کا نام ہے کوثر۔ بازار سے مجھے اپنی کار میں یہاں چھوڑنے آئی ہیں۔ بڑی اچھی ہیں۔"

کنول اور پروین دونوں نے برجیس کا شکریہ ادا کیا۔

چاروں کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔

کنول نے تنویر سے سامان لے کر اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے پھر پوچھا۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

"بازار گیا تھا۔ تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں دیکھو میں کیا لایا ہوں۔"

کنول سامان کھولنے لگی۔

"کیا لائے ہیں؟"

"دیکھ لو۔"

کنول خوشی میں چلّا پڑی۔

"اوئی اللہ۔ اتنی پیاری ساڑھی اور بلوز"

اخاہ۔ یہ جوتا بھی۔

اور یہ مٹھائی۔ کہاں سے یے آپ نے اتنے پیسے۔

تنویر۔ کنول کی حالت پر مسکرا دیا۔

تصویروں کی دوکان پر میں نے کچھ تصویریں بنا کر رکھی ہوئی تھیں اُن کا آج حساب ہے۔ اور ہاں یہ سو روپیہ بھی ہے۔ اپنی پسند کی کوئی بھی چیز لے لینا۔"

تنویر نے نوٹ اپنے سامنے میز پر رکھ دیئے۔ اور ٹٹول ٹٹول کر مٹھائی کے لفافے سے لڈو نکالتے ہوئے کہا۔

ذرا منہ اِدھر کرنا کنول۔"

کنول نے منہ کھول کے آگے بڑھا دیا۔

اس لمحہ پروین بول پڑی۔

"امی آج اگر زندہ ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں۔"

تنویر کے ہاتھ سے لڈو گر گیا۔ اور اس کی حالت عجیب سی ہو گئی۔ آنکھیں بند کر کے اس نے اپنا سر کرسی کی پشت پر لٹکا دیا۔

کنول بیچاری کا رنگ بھی بدل گیا۔ دکھ میں اس نے پروین سے کہا۔

یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔

تھوڑی دیر تک سب خاموش رہے۔ بس غمگین اور اُداس سے بیٹھے رہے

آخر کنول نے تنویر کا شانہ ہلایا۔

لڈو نہیں کھلائیں گے۔

تنویر سنبھلا۔

اور لفافے سے ٹٹول کر دوسرا لڈو اٹھایا۔ کنول نے مُنہ کھول کے آگے بڑھایا اور نے لڈو اس کے مُنہ میں ڈال کر اس کے خوبصورت گالوں پہ پیار سے ہلکی سی چپت لگائی

"پاس ہونے کی مُبارک"

کنول خوش ہو گئی۔

"شکریہ۔ آپ کو کیسے پتہ چلا"

"میں نے دوکاندار کو اخبار میں تمہارا رول نمبر دیکھنے کو کہا تھا"

برجیس نے بھی مبارک باد دی۔ کنول نے اس کا بھی شکریہ ادا کیا۔

چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی ہوئی۔ جسے برجیس نے توڑا اور کنول سے مخاطب ہوئی

میری ایک سہیلی نے بھی امتحان دیا تھا۔ پتہ نہیں پاس ہوئی کہ فیل"

"کیا ہے اس کا"

"فرخندہ"

کنول نے تعجب کا اظہار کیا۔

وہی جس کی ماں کا نام سکینہ اور بھائیوں میں سے ایک کا نام انیس اور دوسرے کا نام ہے۔"

ہاں ہاں بالکل وہی۔ تم کیسے جانتی ہو اسے"

"کچھ عرصہ وہ میری بھی سہیلی رہی۔ مگر میں نے اُسے دھتکار دیا۔ وہ تو فیل ہو گئی۔ اوئی اچھی لڑکی نہیں وہ"

"ہاں خالص مغربی تھی۔ کلب ہر روز بلاناغہ جاتی تھی۔ وہیں ایک لڑکے سے اس کے ملاقات ہو گئے۔ بہت احتیاط برتی۔ مگر پھر بھی ——— وہ ہو ہی گیا۔ آخر امتحان کے فوراً بعد ہی اس نے سول میرج کر لی"

کنول نے تعجب کا اظہار کیا۔

مجھے اِس خبر کا علم نہ تھا۔ گھر والوں نے کچھ نہ کہا اسے"

برجیس نے طنزیہ کہا۔

کیا کہنا تھا وہ خود مغربی ہیں۔ اُن کے ہاں یہ بات کوئی اہم نہیں"

"ہائے اللہ! ہم جیسی اگر ایسی ویسی حرکت کرتی تو ماں باپ بیچارے ڈوب مرتے کچھ کھا کے ہی سو رہتے"

"اور کیا"

کنول اُٹھنے لگی۔

"میں آتی ہوں چائے بنا لاؤں"

پروین نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

"تم بیٹھو۔ میں بنا لاتی ہوں" پروین اُٹھ کر باہر نکل گئی۔

برجیس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”کنول! مجھے کچھ علیحدگی میں کہنا ہے۔“

”چلو دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔“

دونوں کھڑی ہو گئیں۔ کنول کو اچانک کوئی بات یاد آ گئی۔

ذرا ٹھہریں۔ وہ واپس مڑی۔ ایک سگریٹ سلگایا۔ تنویر کے قریب آئی۔ مٹھائی کی مٹھی بھر کے زبردستی اس کے منہ میں ٹھونسی اور سگریٹ ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔

”میں اور کوثر سامنے والے کمرے میں ہوں گی۔ ابھی آتی ہیں۔“

تنویر مسکرا دیا۔

”شریر۔“

دونوں دوسرے کمرے میں آ گئیں۔ کنول نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

”کیا کہنا ہے؟“

برجبیں سنجیدہ ہو گئی۔

”جو کچھ کہوں گی تمہیں اعتبار ہو جائے گا اس کا۔“

”پہلے کہو تو“

میں اگر کہوں کہ میں تنویر کی بیوی ہوں پھر؟“

کنول کا چہرہ سرسوں کی طرح پیلا پڑ گیا۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“

”سچ کہتی ہوں سنو۔“

”لیکن مجھے تو انہوں نے آج تک نہیں بتایا اور جھوٹ کہنے کی ان کو عادت بھی نہیں۔ ہر

ے سامنے بڑی ہی صاف گوئی سے کہہ دیتے ہیں۔“

پہلے سنو تو۔ بات ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ہاں۔ تو یہ پچھلے برس

ہے کہ میں تنویر کو جو پہلے توقیر تھے۔ ان کی تصویروں کی وجہ سے چاہنے لگی تھی جو بھی

ان کی تصویر آتی میں خرید لیتی تھی میں نے گو انہیں دیکھا ہوا نہ تھا۔ پھر بھی اُن

کرنے لگی۔ دبے دبے لفظوں میں میں نے اپنے بھائی سے اپنی محبت کا اظہار بھی

ے صرف اتنا پتہ تھا کہ توقیر کوئی غریب لڑکا ہے اور بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔

رجبیں نے روک کر سانس لیا۔

ھے دکھانے کے لیے بھائی جان توقیر کو اپنے گھر میں لائے۔ لیکن بدقسمتی سے توقیر کی ماں

پاس یہ پہلے رہتے تھے ان دنوں ہمارے ہاں ملازمہ تھی۔ مجھے خبر نہ تھی کہ وہ توقیر

ہے بہر حال توقیر جب میرے بھائی قیصر کے ہمراہ ہمارے ہاں آئے تو انہوں نے

ماں کو دیکھ لیا۔ اتنے میں میں بھی باہر آئی۔ یہ دونوں ماں بیٹا اس وقت باتیں کر رہے

ہنے اُن کی امی سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے توقیر کو سوسائٹی میں گرنے سے بچانے

ہہ دیا کہ یہ جناح روڈ کے کسی بہت بڑے جاگیردار کے لڑکے ہیں اور میں پہلے اُن

ملازم تھی۔

رجبیں نے پھر سانس درست کیا۔

ں کے علاوہ یہ ایک بار روپ پور سے اپنی خالہ کو لے کر آ رہے تھے کہ ایک اسٹیشن

ے اور گاڑی چل پڑی۔ جلدی میں یہ میرے فسٹ کلاس کے کمپارٹمنٹ میں بیٹھ گئے۔

میرا ان کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا۔ اور میں نے ان کو خوب سیدھیاں سنائی تھیں۔ اب

ان دو حادثوں نے ایک گاڑی والی لڑائی۔ دوسرے ان کا کسی بہت بڑے جاگیردا
ہونا میرے دل میں ان کے لیے نفرت پیدا کر گئے کیونکہ میں تو اس غریب تصویریں
والے توقیر سے محبت کرتی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی۔ یہ وہی ہیں۔

مہ جبیں نے کنول سے پوچھا۔

"میری بات کی سمجھ آ رہی ہے"

کنول نے بڑی دلجمعی سے کہا۔

ہاں ہاں کہتی جاؤ۔

میرے بھائی جان کے ایف آر سی ایس کے لیے فارن جانے کو چند دن رہ گئے
شادی کی تیاری شروع ہوئی۔ بھائی جان کے جانے سے دو روز پہلے شادی ہو گئی۔ پہلی
جب یہ میرے پاس آئے تو انہیں دیکھ کر مجھے بھائی جان پر بڑا غصہ آیا۔ میں سوچ بھی نہ
کہ اس توقیر سے شادی ہو جائے گی۔ بہر حال میں نے سہاگ کی رات انہیں دیکھتے ہی صا
دیا کہ میں آپ سے نفرت کرتی ہوں۔ یہ دل برداشتہ سے ہو کر میرے پاس سے اٹھ گئے۔
وقت بھائی جان سے بات کرنا چاہتی تھی۔ لیکن انہوں نے روک لیا اور کہا کہ مجھے ایک
مہلت دو۔ پھر میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ کیونکہ میری ماں بیمار ہے۔ اگر اسے اس
کا پتہ چلا تو وہ بچ نہ سکے گی۔

کنول بیچ میں بولی

خاصی دلچسپ کہانی ہے۔

بھائی جان ہمیں اپنے ساتھ کراچی لے گئے ان کا خیال تھا ہم دونوں وہاں رہ کر

گے۔ بہر حال بھائی جان وہاں سے دوسرے دن چلے گئے۔ ہم وہاں کچھ دن رہے اس
ان کی خالہ فوت ہو گئیں۔ اور ہم واپس آ گئے سٹیشن سے یہ اپنے گھر چلے گئے۔ اور میں
گھر آ گئی۔ اس کے بعد یہ واپس نہ آئے بعد میں ایک بار میں نے انہیں مچھلی مارکیٹ
مچھلی بیچتے دیکھا تو میں بڑی متاثر ہوئی اور ساری مچھلی خرید کر انہیں اپنے گھر لائی۔
انہوں نے مجھے پہچاننے سے انکار کر دیا اور اپنا نام راجو مچھیرا بتایا۔ بعد میں پھر مچھلی لینے گئی لیکن
وہی بتایا اس کے بعد کچھ عرصہ تک میں بیمار رہی۔ دوبارہ جب مچھلی مارکیٹ گئی تو اُن کے
دوست سے پتہ چلا کہ اصل میں جاگیردار توقیر، راجو مچھیرا اور تصویریں بنانے والا توقیر ایک
ہی ہے۔ میں ان کے پرانے گھر بھی گئی۔ لیکن یہ اسے چھوڑ چکے تھے۔ اس کے بعد میں
دو سے انہیں تلاش کرتی رہی۔ آخر آج بازار میں مل ہی گئے۔ میرا اصل نام مہ جبیں
لیکن میں نے بازار میں انہیں اپنا نام کوثر بتایا۔ شکر ہے انہوں نے مجھے آواز سے پہچانا

مہ جبیں نے ذرا رک کے کہا۔

"اب بتاؤ قصور کس کا ہے؟"

کنول نے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں کہا۔

نہ ان کا قصور نہ تمہارا نہ ہی ان کی اس ماں کا سارا قصور تمہارے بھائی کا ہے۔ اسے
چاہیے تھا شادی سے پہلے پورے حالات تمہیں بتایا۔"

مہ جبیں خوش ہو گئی۔

بہت عقلمند ہو۔ اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں نہ جانتے ہوئے بھی کہ تم توقیر سے

سے محبت کرتی ہو اپنی قسمت کا فیصلہ تم پر چھوڑتی ہوں۔ جو تم کہو گی مجھے بلا حیل وحجت
ہو گا۔"

کنول نے کچھ سوچا پھر دکھ سے کہا۔

مجھے ان سے محبت ضرور ہے۔ لیکن میں تمہارے حالات کے پیش نظر اپنے حق
دستبردار ہو جاؤں گی۔

برجبیس نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں نہیں میں ایسا نہیں چاہتی۔"

کنول ششدر سی رہ گئی۔

"پھر"

میں چاہتی ہوں۔ ہم دونوں کو ہی اپنی اپنی محبت مل جائے۔"

تمہارا مطلب ہے میں بھی ان سے شادی کر لوں۔"

"بالکل۔ ہمارے مذہب میں ایک مرد کئی بیویاں رکھ سکتا۔ میں چاہتی ہوں پہلے
آنکھوں کا آپریشن کرایا جائے پھر تمہارے ساتھ شادی ہو جائے گی۔ میرا ابھی ان کے
ذکر نہ کرنا۔ میں کوثر بن کر ہی ان کی خدمت کروں گی۔ جب ان کی آنکھیں ٹھیک ہو جائیں
اُن سے بات کرنا۔"

کنول نے گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"سوچ لو۔"

برجبیس نے وثوق سے کہا۔

بہت سوچ چکی۔ خدا نے چاہا تو میں تمہیں اِس طرح رکھوں گی۔ جس طرح ایک بڑی
اپنی چھوٹی بہن سے پیار اور محبت کرتی ہے۔"

کنول خوش ہو گئی۔

"وعدہ ہوا؟"

"پکا وعدہ"

"مجھے منظور ہے۔"

دونوں نے ہاتھ ملائے۔ برجبیس نے ہاتھ ہلا کے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک بڑی بہن کا ہاتھ ہے؟"

کنول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

مجھے بھی چھوٹی بہن سے کم نہ پاؤ گی۔"

دونوں کھل کے ہنس دیں۔

کنول نے موضوع بدلا۔

اب بتاؤ تنویر کے آپریشن کا کیا کرنا چاہیے۔

برجبیس نے جھٹ کہا۔

میں آج سارے انتظام مکمل کر لوں گی۔ کل صبح ہی تنویر کو آپریشن کے لیے ہسپتال لے
چلیں گے۔

تم اس میں کوئی تبدیلی چاہتی ہو۔

"نہیں ٹھیک ہے۔"

پروین چائے لے آئی۔ پہلے ایک کپ بنا کے تنویر کو دیا گیا۔ پھر تینوں بیٹھ کے پینے لگیں۔

چائے کے دوران برجبیس نے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ان کا تعارف تو تم نے کرایا ہی نہیں کنول!"

کنول بیچاری کی حالت تکلیف دہ ہو گئی۔

"یہ تنویر کی بہن ہیں"۔

برجیس نے سراسیمگی سے پوچھا۔

"سگی بہن ہیں کیا؟"

"بالکل"

"مجھ سے تو انہوں نے ذکر نہیں کیا"

"اُن کی حالت ایسی ہے جو بیان ہی نہیں کی جا سکتی"

"کیوں؟"

آج سے کئی برس قبل کا واقعہ ہے۔ یہ تنویر کو کھلانے گھر سے باہر نکلی تھیں کہ غنڈوں نے انہیں اغوا کر لیا۔ تنویر کو تو انہوں نے کسی گلی میں ڈال دیا۔ جہاں سے اُنہیں وہ لوگ لے گئے جنہوں نے انہیں آنکھوں کی بینائی سے محروم کر دیا ہے اُن کو انہوں نے پالا پوسا۔ جب جوان ہوئیں تو رقاصہ اور طوائف بنا کر اس بازار میں بٹھا دیا۔ اپنی امی سے ایک دن ان کی بازار میں ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسری کو پہچان لیا۔ اس دن سے یہ اپنی امی کو بھی ملنے آتی ہیں لیکن تنویر کے سامنے کبھی نہ آئیں۔ ویسے انہیں علم ہے کہ میری بہن طوائف ہے اب یہ بیچاری روز آتی ہیں صرف تنویر کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے ان کے سامنے یہ عاصیہ کے نام سے جاتی ہیں اور انہیں اپنے آپ کو ہمارا ہمسایہ کہا ہوا ہے۔ ویسے ان کا اصل نام پروین ہے۔ تنویر کو پتہ نہیں کہ ان کی بہن عاصیہ کے روپ میں اُن سے باتیں کرتی ہے"۔

کنول رک گئی،

"یہ ہے اُن کی اصل داستان"۔

پروین بری طرح رونے لگی تھی۔

برجیس نے افسوس کیا۔

"چ چ چ۔ بڑے ظالم ہوتے ہیں یہ مرد۔ ایک عورت کے ساتھ یہ کتنا بڑا ظلم ہے یہ اس چھوڑ کیوں نہیں دیتیں"

کنول نے غمگین لہجے میں کہا۔

"وہ لوگ انہیں تھوڑا ہی آنے دیتے ہیں۔ ملنے کی اجازت بھی بڑی مشکل سے دے ہے۔ ایک آدمی ساتھ آتا ہے اور جتنی دیر یہ یہاں رکتی ہیں وہ مکان کے باہر اِدھر اُدھر رہتا ہے۔ رات رہنے کی قطعاً اجازت ہی نہیں"۔ ہم نے آج تک صرف اپنی بے عزتی کی نظر اس بات کو آگے نہیں بڑھایا۔ نہ ہی پولیس سے کسی قسم کی مدد لی"۔

برجیس بیچاری نے ہمدردی جتائی۔

"پھر کیا کرنا چاہیئے ان کا؟"

"تنویر کی آنکھیں اللہ کرے ٹھیک ہو جائیں تو پھر ان سے کھل کر بات کروں گی"۔

برجیس کھڑی ہو گئی۔

"اچھا کنول! میں چلی کل صبح سویرے آؤں گی۔ تنویر کو تیار رکھنا اور خود بھی تیار رہنا، ہسپتال چلیں گے"۔

کنول بھی کھڑی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے"

برجیس چلی گئی۔ کنول اور پروین وہاں سے اُٹھیں اور تنویر کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

توقیر کی آنکھوں کا آپریشن ہو گیا۔

کنول ہر روز پہروں اس کے پاس آکر بیٹھی رہتی۔ برجبیس، کوثر کے نام سے اور پروین عاصیہ کے روپ میں اس کے ساتھ آتیں اور تنویر کے پاس بیٹھ کر اس کی دلجوئی کرتی رہتیں دن گزرتے رہے کچھ دکھ کے کچھ سُکھ کی ملاتیں اُڑتی رہیں کبھی تاریک کبھی روشن۔

آج بدھ تھا اور تنویر کی پٹی کھلنا تھی۔

برجبیس صبح ہی صبح کنول کے پاس پہنچی وہ اس وقت ناشتہ سے فارغ ہوئی تھی بر آندھی کی طرح آئی اور آتے ہی اُسے ہلکی سی ڈانٹ پلا دی۔

"حد ہے۔ تم ابھی تک تیار ہی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا صبح ہی اُن کی پٹی کھول دیں گے۔

کنول تولیے سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔

"پروین باجی بھی آجائیں پھر اکٹھے ہی چلتے ہیں۔"

"تم خود تو تیار ہونا؟"

"میں تیار ہوں۔ کونسی تیاری رہ گئی ہے۔"

"کپڑے تو بدلو۔"

"انہی میں جاؤں گی میں۔"

"برجبیس نے کنول کا کان پکڑ کر کھینچا۔

"منی! ان کی جب پٹی کھلے گی تو تم اُن کے سامنے کھڑی ہو گی ناکہ تمہیں دیکھتے ہی وہ خوش ہو جائیں۔ میں اور پروین ساتھ والے کمرے میں رہیں گی۔ تم دونوں اِدھر آجانا۔ میں اور پروین اِدھر سے ہی چلی جائیں گی اس کے بعد کوئی اگلا قدم اٹھایا جائے گا۔

کنول نے مذاق کیا۔

"اُن کے سامنے تو تمہیں کھڑا ہونا چاہیئے باجی! تم اُن کی بیوی جو ہو۔ میں تو ابھی امیدوار ہوں۔ میرا کیا سکوپ ہے آپ کے ہوتے ہوئے۔"

برجبیس سیریس ہو گئی۔

انہیں تم سے محبت ہے کنول! مجھ سے تو وہ نفرت کرتے ہیں۔ پٹی کھُلتے ہی اگر اُنہوں نے مجھے دیکھا تو انہیں کسی قسم کی خوشی نہیں ہو گی بلکہ مجھے دیکھتے ہی بیزار ہو جائیں گے۔ تمہیں دیکھ کر وہ یقیناً خوش ہو جائیں گے۔"

کنول نے سر جھکا لیا۔

" جیسے تمہاری مرضی۔"

اتنے میں پروین آگئی - برجبیس نے جھٹ کہا۔

" لو پروین بھی آگئی۔ جلدی جلدی کپڑے بدلو - وہی ساڑھی - بلوز اور جوتا پہننا جو تمہارے پاس ہونے کی خوشی میں وہ لائے تھے "

"جب وہ تمہیں دیکھیں تو بتانا بھی یہ کپڑے لائے تھے آپ۔"

کنول جلدی جلدی لباس تبدیل کرکے پھر برجبیس کے پاس آئی تو وہ اُسے دیکھ کے۔

اوئی اللہ۔

دنگ رہ گئی۔

کنول یوں لگ رہی تھی۔ گویا پریوں کے دیس سے کوئی رانی نکل پڑی ہو یا ——— یا نیلے آکاش سے کوئی نازک نازک سی خوش رنگ وخوش اندام تتلی اترتی ہو۔

برجبیس نے غور سے اُسے دیکھا۔

" بہت اچھی اور پیاری لگ رہی ہو منی! بس ایک کمی رہ گئی ہے"

کنول شرما گئی۔

"کیا؟"

" بس ——— وہ ——— تھوڑا سا سنگار بھی کرلو"

" چھوڑو باجی! رہنے دو"

برجبیس نے اسے زبردستی پکڑ لیا۔

" ارے نہیں منی! کمرے کے دوسرے کونے میں جاکر برجبیس نے اُس کا چہرہ پف

کیا۔ اور اس کے گلاب کے سے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا ہلکا سا شیڈ بھی لگا دیا۔

کنول کی حالت اَب؟

ہائے

اس سے قیامت بن گئی تھی۔

تینوں ہسپتال پہنچیں۔ کنول جاکر تنویر کے پاس بیٹھ گئی - برجبیس اور پروین ساتھ والے

کمرے میں بڑی بیتابی سے پٹی کھلنے کا انتظار کرنے لگیں۔ آخر ڈاکٹر آیا اور پٹی کھل گئی۔ کنول

اٹھ کر کھڑی ہوگئی تنویر نے دو ایک بار آنکھیں جھپکیں پھر مُسکرا کر کنول سے کہا۔

میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کنول - میں اَب دیکھ سکتا ہوں۔ میری آنکھیں ٹھیک ہوگئیں"

ڈاکٹر مسکرا دیا۔

" مبارک ہو مس کنول!"

کنول پھولی نہ سما رہی تھی۔

"شکریہ"

تنویر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

" ڈاکٹر! میں تمہارا بہت مشکو[illegible] نئی زندگی بخشی ہے تم بہت دردمند

اور غمگسار ہو"

ڈاکٹر پھر ہنس دیا۔

"کوئی بات نہیں"

دوسرے کمرے میں برجبیس اور پروین تنویر کی آنکھیں ٹھیک ہوجانے پر بے پناہ

خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔

تنویر بستر سے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔

"میں اب جا سکتا ہوں ڈاکٹر؟"

ڈاکٹر نے اپنے سر کے سفید بالوں کو کھجاتے ہوتے پدری شفقت سے کہا۔

"بالکل جا سکتے ہو۔"

تنویر نے ڈاکٹر سے مصافحہ کیا اور کمرے سے باہر آیا۔

کنول بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آئی۔

ہسپتال سے نکل کر دونوں سڑک پر آئے اور رکشا میں بیٹھ گئے۔

کوئی پندرہ منٹ بعد تنویر اور کنول گھر داخل ہوئے۔ تنویر بیچارہ کنول کو آج دیکھ دیکھ کے ہی خوش ہوا جا رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ بڑی چاہت سے کہنے لگا۔

"کنول حد ہو گئی۔"

کیوں کیا ہوا۔

میں نے آج تک تمہیں اس قدر خوبصورت نکھار میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔"

کنول دھیمے سے مسکرا دی

"چلو اچھا ہوا آج تو دیکھ لیا۔"

"اس ساڑھی اور بلوز میں تو یوں دکھائی دے رہی ہو گویا نیلے آکاش پر چمکتا ہوا بدرِ کامل۔"

"وہی ساڑھی اور بلوز ہے جو آپ پچھلے دنوں لائے تھے۔"

"چلو شکر ہے تمہیں پسند تو آئے۔"

اچھا باتیں نہ بنائیے۔ پہلے اٹھیے اُٹھ کے نہا لیجئے اور بعد میں شیو کر لیں۔ میں اتنی دیر میں کپڑے بدل کے کھانا تیار کرتی ہوں۔"

"تنویر کھڑا ہو گیا۔"

"نہاتا تو ہوں لیکن ایک شرط پر۔"

"کیا؟"

"تم ابھی کپڑے نہیں بدلو گی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں ذرا ان کپڑوں میں تمہیں جی بھر کے دیکھ تو لوں۔"

"اچھا نہیں بدلتی۔ نہا لیں اُٹھ کے۔"

تنویر صابن تولیہ لے کر باہر نکل گیا۔ کنول اندر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ جلد ہی تنویر غسل کر کے اندر آیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"تیل لگا کے کنگھی تو کر دو کنول"

"آج تو خود کریں نا۔"

"بس آخری بار کر دو پھر تکلیف نہ دوں گی۔"

کنول نے تیل لگا کر کنگھی کر دی۔

تنویر پھر بولا۔

"شیو بھی بنا دو نا کنول۔"

کنول نے ڈانٹ پلائی۔

"یہ کیا۔ آج خود کریں"

"اچھی کنول نہیں؟ بس میں دیکھنا چاہتا ہوں تم میرے کام کس طرح کرتی رہیں!"

کنول اٹھی پہلے صابن لگایا۔ پھر بڑے ہولے ہولے شیو کرنے لگی۔ تنویر اس کی ایک ایک ادا پر مسکرا رہا تھا۔

کنول نے شیو کر کے اس کا چہرہ صاف کیا۔ اور پھر کریم لگا دی۔

"بس"

"نہیں ایک سگریٹ بھی پلا دو۔ ذرا سلگا کے"

خود سلگا لیجیے اٹھ کے مجھے تو سگریٹ سلگا سلگا کر کھانسی ہو گئی"

"بس ایک سگریٹ پلا دو کنول!"

وہی بچوں کی سی ضد کرتے ہیں نا آپ۔ ماروں گی کسی وقت"

تنویر نے اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

"لو مارو"

کنول کو اس کی اس ادا پر پیار آگیا۔ ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگا دی۔

"شریر"

اپنے میز کی طرف وہ گئی۔ سگریٹ سلگایا اور تنویر کو تھما دیا۔

"بس اب تو خوش ہیں نا"

"صرف ایک کام رہ گیا"

"کیا؟"

"ادھر آؤ"

تنویر اس کا ہاتھ پکڑ کر آئینے کے سامنے لے گیا پھر آئینے میں اپنے اور کنول کے عکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے خیال میں اس لڑکے اور لڑکی کا جوڑ کیسا رہے گا؟"

کنول نے تنویر کا کان پکڑ کر کھینچا۔

بہت شریر ہو گئے ہیں۔

پھر وہ اپنے بازو چھڑا کر بھاگتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ پھر باہر آکر کھانا تیار کرنے لگی۔ تنویر نے کنول کی کتابوں کے میز پر سے ایک میگزین اٹھایا اور بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

دوسرے روز کنول کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرنے کے بعد تنویر اُٹھا اور باہر جانے لگا کنول
نے برتن سمیٹتے ہوئے اُسے روکا۔

"کہاں چلے ہیں؟"

"ذرا باہر چلا ہوں جلدی آجاؤں گا۔"

"کہاں؟"

"بازار مسعود کے پاس جاؤں گا۔ اُسے کہوں گا آج سے پھر میں اس کے ساتھ اپنے
پرانے کام پر جایا کروں گا۔"

کنول نے اسے گھورا۔

"آپ آرام سے بیٹھ نہیں سکتے؟"

واہ! بیکار پڑے رہنے کا کیا فائدہ۔ انسان کو کچھ کرنا چاہیئے۔ یہ تو نہیں کھانے کو
ادر کمانے کو استغفراللہ۔ اچھا میں چلا اب شام کو ہی آؤں گا۔ کوئی چیز منگانی ہو تو
لکھ دو، آتی دفعہ لیتا آؤں گا۔"

کنول نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور کرسی پر بٹھا دیا۔

میں کہتی ہوں بیٹھیے مجھے کام ہے آپ سے۔

تنویر دھم سے کرسی پر گر گیا۔

چلو کہو"

بس بیٹھے رہیئے میں تیار ہو لوں۔ پھر میرے ساتھ جانا ہے آپ نے۔"

دھر؟"

جبیں کے ہاں۔

ر سنجیدہ ہو گیا۔

نا برجبیں؟"

آپ کی بیوی اور کون۔ وہ کونز لڑکی جو آپ کو بازار سے لائی تھی وہ برجبیں ہی تھی۔

پ سے اپنا نام غلط کہا تھا۔"

! تو اُس نے تمہیں کوئی غلط پٹی پڑھائی ہے۔"

اس بچاری نے کیا کہنا تھا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے وہ۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا۔
پ کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں اس سے دوسرے روز میں آپ کو اس کے پاس لے کر
دونوں میں ناراضگی دُور کر کے صلح کرا دوں گی۔"

بس تم یہ صلح کے عہد نامے اپنے پاس ہی رکھو۔ میں تو اس کے ہاں کبھی نہیں جاؤں

"کیوں نہیں جائیں گے آپ؟"

"میری مرضی۔"

"آخر وہ آپ کی بیوی ہے۔ کب تک اس سے ناراض رہیں گے؟"

تنویر نے جلدی میں کہا۔

"تمہاری بیوی ہوگی۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ابھی اسے طلاق دے

ہوں۔"

کنول نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ نے اسے اگر طلاق دے دی۔ تو میں آپ سے کبھی بات نہ کروں گی اب

کے ساتھ سکون کی زندگی بسر کرنا ہوگی۔"

تنویر غصے میں آ گیا۔

"اب میں سمجھا تمہاری چال کو۔ اس طرح تم مجھ سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتی ہو

یونہی اگر منجدھار میں چھوڑ دینا تھا تو محبت کی پینگیں کیوں بڑھائیں۔

کیوں مجھ سے ایسا سلوک کیا کہ میں سب کچھ ہی بھول گیا۔

میری آنکھوں کا علاج کرا کے کیوں مجھے نور بخشا تاکہ میں دنیا کے غم اور دکھ

اس سے تو بہتر تھا میں اندھا ہی رہتا۔

نہ اپنی ہوش ہوتی نہ کسی کی پرواہ۔

نہ کسی کا کوئی غم نہ ہی کوئی دکھ۔

یں ٹھوکریں کھا کھا کے زندگی گزر ہی جاتی۔

زار رونے لگی۔

غلط سمجھ رہے ہو تنویر!

یہ کہتا رہا۔

ھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ اگر ایسا سلوک کرنا تھا تو مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ میں ہمیشہ

ں گھر کو چھوڑ دیتا۔ اب بھی میں تمہارے راستے میں دیوار نہ بنوں گا۔ تم اپنی پسند اور

ستہ اختیار کرو۔ لیکن مجھے تم بھی کسی راہ پر چلنے کے لیے مجبور نہ کرو۔ تم ڈاکٹر ہو اور میں

بوٹ۔ یہ بھی بھلا کوئی جوڑ ہے۔

ل زور سے چلائی۔

یر! خدا کے لیے چپ رہو۔"

یر نے میز پر پڑی ہوئی چھری آگے بڑھا دی۔

ہاتھوں سے ان آنکھوں کا علاج کرایا ہے۔ ان سے ہی پھوڑ دو۔ ان کو مجھے ایسی آنکھیں

یں جو مجھے یوں جگہ جگہ کی ٹھوکریں دلاتی پھریں۔"

کا رنگ سرخ ہوگیا۔ اچانک اس کا ہاتھ اٹھا۔ اور ایک بھرپور طمانچہ اس نے تنویر

ے مارا۔

نے آپ سے کہا ایسی باتیں کرنے کو۔ دوبارہ اگر یہ الفاظ کہے تو آپ کو تو کچھ نہ کہوں

نہ آپ کو ضرور ختم کروں گی۔ ان آنکھوں کی بینائی کے لیے تو میں ساری ساری رات

رو رو کے اپنے رب کے حضور بڑی عاجزی سے دعا کر رہی تھی۔" کنول وہاں سے
اور قریب ہی پڑے صوفے پر گر کر زار زار رونے لگی۔

تنویر اپنا گال سہلاتا رہا۔

کمرے میں کنول کی سسکیاں بلند ہوتی رہیں۔

تنویر نے کچھ سوچا۔ پھر اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ شاید باہر نکلنا چاہتا
اتنے میں کنول برق کی سی تیزی سے اُٹھی اور تنویر کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

معاف کر دو تنویر! کہیں نہ جاؤ"

مَیں مر جاؤں گی تنویر!

تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔

کنول نے اپنا سَر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔

معاف کر دو تنویر! خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔

تم ناراض ہو گئے تو میں مر جاؤں گی۔

وہ اپنے آنسوؤں سے تنویر کے پاؤں بھگونے لگی۔

میں مٹ جاؤں گی تنویر! لِلّٰہ معاف کر دو۔

تنویر نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔

رُلاتی بھی ہو اور ہنساتی بھی ہو۔ تنویر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

کنول اُس کی چھاتی سے لگ کر رونے لگی۔

تنویر اسے اپنے ساتھ لپٹائے صوفے پر بیٹھ گیا۔ کنول ابھی تک سسک رہی تھی۔

تسلی دے دے کر بڑی مشکل سے چُپ کرایا۔ کنول سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور آنکھیں خشک
تے ہوئے کہا۔/

"بہت کٹھور ہیں آپ۔ میں نہیں بولوں گی اب آپ کے ساتھ"

تنویر کو مذاق سوجھا۔

پھر کس کے ساتھ بولو گی؟"

کنول مُسکرا پڑی۔

"اپنی جان کے ساتھ"

"کون ہے تمہاری جان؟"

"وہ —— اس کا نام تنویر ہے"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

تنویر اُٹھ کھڑا ہوا۔

"مَیں اب بازار جاؤں کنول!"

"پہلے میرے ساتھ چلیئے۔"

"وہاں تو مَیں نہیں جاؤں گا۔ اچھا مَیں چلا وہ باہر نکلنے لگا"

کنول اُٹھی اور بھاگ کر دروازے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

نہیں جانے دوں گی آپ کو"

"تنویر نے خفگی سے کہا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"پہلے آپ بیٹھ کے میری پوری بات تو سنیئے۔"

"اچھا آؤ۔"

دونوں بیٹھ گئے۔

"آخر تم مجھے وہاں لے جانے پر اتنی بضد کیوں ہو؟" تنویر نے ذرا جستجو سے پوچھا۔

وہ بچاری رو رہی ہوگی۔ بہت چاہتی ہے آپ کو۔ میں نے اس کے ساتھ آج آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی کنول۔ اُسے مجھ سے نفرت ہے اور نفرت بھی سخت قسم کی۔ سُنو میں تمہیں پوری کہانی سُناتا ہوں۔"

وہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے اُس نے جو کچھ کیا صرف ایک غلط فہمی کی بنا پر کیا۔"

"کیا غلط فہمی تھی اُسے؟"

وہ شروع سے ہی آپ کو چاہتی ہے۔ بازار میں جو بھی آپ کو اس نے دیکھا ہوا تھا۔ صرف اتنا جانتی تھی کہ آپ عزیب ہیں اور بی۔ اے میں پڑھتے ہیں۔ اپنی اِس محبت کا اظہار اس نے اپنے بھائی سے بھی کیا۔ وہ آپ کو گھر لے گیا اور اندر لے جا کر برجیس سے آپ کا تعارف کرانا چاہتا تھا کہ آپ کی مڈبھیڑ اپنی امّی سے ہوگئی جو ان دنوں وہاں ملازم تھیں۔ اور اُنہوں نے آپ کو سوسائٹی میں گرنے سے بچانے کی خاطر ایک بہت بڑے جاگیردار کا لڑکا بتا دیا۔ اس کے بھائی قیصر نے اس راز کو افشا نہ کرنے کی خاطر ایک بہت بڑے جاگیردار کا بتا دیا.... برجیس کو یہ نہ بتایا کہ اصل میں تصویریں بنانے والے توقیر آپ ہی ہیں۔ وہ آپ کو جاگیردار سمجھ کر نفرت کرنے لگی کیونکہ اسے تو اس عزیب توقیر سے محبت تھی جو تصویریں

کر اپنی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس کے علاوہ گاڑی میں بھی آپ دونوں کا جھگڑا ہوا اور آپ خلاف اس کی نفرت اور گاڑھی ہوگئی۔ لہٰذا اس نے آپ کو پہلی رات ہی قبول کرنے سے انکار یا۔

کنول ذرا رُکی۔

اس کے بعد وہ دن رات دوسرے توقیر کی تلاش کرتی رہی۔ حالات نے پھر اس کی آپ ملاقات کرائی تو آپ انجان بن گئے اور اپنا نام راجو رکھ لیا۔ اس کی جستجو اور بڑھی۔ وہ اور ہ سرگرمی سے آپ کے پیچھے بھاگنے لگی۔ راجو کے روپ میں وہ آپ سے محبت کرنے لگی اور ، دونوں توقیر کو بھول گئی۔ اُسے صرف آپ کی عزبت۔ جفاکشی اور سادگی سے محبت ہوگئی اپ کے پیچھے بھاگتی رہی۔ حالات بگڑ گئے اور زمانے نے آپ کو آنکھوں کے نور سے م کر دیا۔ اس کی جستجو اور بڑھی۔ مسعود سے آپ کے متعلق اس نے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ل میں جاگیردار توقیر، راجو مچھیرا اور تصویریں بنانے والا توقیر ایک ہی ہستی کے تین روپ اب وہ والہانہ آپ کو چاہنے لگی۔ اور دن رات آپ کو تلاش کرتی رہی آخر اس روز آپ ار میں اسے مل گئے اور وہ اپنا نام کوثر بتا کر آپ کو یہاں لے آئی اب آپ ہی بتایئے اس ی داستان میں اس کا کوئی قصور ہے۔

تنویر نے سر جھکا دیا۔

مجھے کوئی پتہ نہیں۔ میں اب زندگی کا راستہ بدل چکا ہوں۔ اس سے قطع تعلقی میں ہی ی بہتری ہے۔"

کنول نے گرہ لگائی۔

"دونوں راستے ایک ہی جگہ مِل بھی تو سکتے ہیں"

"کیا مطلب تمہارا"

"میرا مطلب ہے مَیں بھی آپ کے ساتھ ——— کنول شرما گئی۔

"یعنی تم بھی شادی کر لو گی مجھ سے"

"ہاں"

"سوچ لو۔ بڑی تلخ زندگی ہو گی میری بھی اور تمہاری بھی"

بہت سوچ چکی۔ آپ فکر نہ کریں تلخی کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا میں اور پرجبیں اس طرح رہیں گی جس طرح دو سگی بہنیں۔ ایسی صورت میں کیا تلخی ہو گی"

"تو پرجبیں کو تم یہاں لاؤ گی۔

"نہیں ہم دونوں وہاں چل کے رہیں گے"

"شادی سے پہلے یا بعد"

نہیں پہلے اور آج ہی۔ یہ پرجبیں کی خواہش ہے"

اتنی جلدی نہ کرو پہلے مجھے کوئی سروس کر لینی چاہیئے"

سروس کی آپ کو کوئی ضرورت نہیں آپ ان کے کاروبار اور جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کریں گے۔ ہاں مجھے اگر آپ نے اجازت دی تو مَیں سروس کر لوں گی۔ ورنہ مَیں اور پرجبیں دونوں آپ ہی کے ڈاکٹر بن کر رہیں گی"

"کاروبار ان کا کیا ہے"

"ایک تو ان کی یہاں کپڑے کی مِل ہے اور بڑے بازار میں تیس دوکانیں ہیں جن میں

ہر دوکان کا کرایہ دو سو روپیہ ہے۔ اس کے علاوہ کراچی میں ان کے پچاس فلیٹ ہیں اور یٹ کا کرایہ سو روپیہ ہے۔ وہاں بھی کپڑے کی ایک مل ہے۔ پرجبیں کو اس کا بھائی قیصر لیا تھا کہ یہ سب کچھ آپ کی تحویل میں دے دے۔ لیکن بدقسمتی سے شروع میں ہی ناراضگی ئی بہر حال اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ صرف آپ کی ایک ہاں پر سارے حالات سنور سکتے ہیں۔ آپ کے دونوں راستے بھی ایک ہی مرکز پر آپ سے بغلگیر ہو سکتے ہیں۔ اب بولئے کیا کہتے آپ"

تنویر ہار مان گیا۔

"میری طرف سے تم جو جی چاہے کرو۔ مجھے تمہارا ہر فیصلہ منظور ہو گا"

"مَیں تو کہتی ہوں ابھی چلیں"

"چلو مَیں تو تیار ہوں۔ تم اپنی تیاری کرو"

کنول خوش ہو گئی جلدی جلدی دوسرے کمرے میں گئی۔ اور وہی کل والے کپڑے ن کر باہر آئی۔

"چلئے چلیں"

تنویر اُٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔

"آؤ"

دونوں پرجبیں کے ہاں داخل ہوئے۔ کریمن بُوا نے بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ تنویر ائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ اور کنول پرجبیں کے کمرے میں گئی۔ وہ اندر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ ی تھی۔ کنول کو دیکھتے ہی پھول کی طرح کھِل گئی اور اُٹھ کر اُسے گلے لگا لیا۔

"تم آگئی منی! مجھے امید تھی تم اپنے وعدے پر ضرور آؤ گی۔ وہ بھی آئے ہیں"
کنول نے مسکرا کے کہا۔

"ہاں ساتھ لے کے آئی ہوں"

"کہاں ہیں؟"

"ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آئی ہوں"

"تم پھر بیٹھو میں ایک نظر انہیں دیکھ آؤں"

"کیوں اتنی بے صبر ہوئی جاتی ہو۔ اب تو وہ ہمیشہ کے لیے تمہارے پاس ہی رہیں گے ویسے بھی اب میں تمہیں ان کا اور ان کو تمہارا منہ رات کو دولہا اور دلہن کے روپ میں ہی دیکھنے دوں گی"

"نہیں کنول پہلے تمہاری شادی ہو گی۔ اس کے بعد وہ میرے پاس آئیں گے تم زیادہ حقدار ہو"

"نہیں پہلے تم"

اوں ہوں پہلے تم ان کے پاس جاؤ گی"
کنول نے شرارتاً کہا۔

"پہلے آپ آپ میں ہی گاڑی نکل جائے گی۔ اور دونوں ہی رہ جائیں گی"

کھلکھلا کے دونوں ہنس پڑیں۔
کنول سنجیدہ ہو گئی۔

"مذاق نہیں برجیس! میں ابھی تمہیں مہندی لگاؤں گی۔ پھر پورا دلہن کا سنگھار

کروں گی۔ افشاں لگاؤں گی۔ کاجل کی ڈوریاں کھینچوں گی۔ عطر میں نہلا کے وہی اس دن والا سرخ جوڑا پہنا کے شام تک پلنگ پر بٹھا دوں گی اور ہاں مجھے اپنا سارا زیور بھی نکال کر دو"
برجیس نے سر جھکا لیا۔

"ٹھیک ہے تم اگر پہلے میرا ہی سر اوکھلی میں دینا چاہتی ہو تو حاضر ہوں قربانی کے لیے"

دونوں پھر ہنس دیں۔
کریمن بوا چائے لے آئی۔ برجیس نے جھٹ پوچھ لیا۔
"تنویر کو چائے دی بوا"
کریمن بھی مسکرا رہی تھی۔
"ہاں دے آئی ہوں"
کنول اور برجیس بھی ہنس ہنس کے چائے پینے لگیں۔

پورا دن کنول بڑی محنت اور جانفشانی سے برجیس کو دلہن بنانے میں مصروف رہی۔ آخر رات آگئی۔ دونوں نے مل کر عروسی پلنگ سجایا۔ کمرے میں ہر سو خوشبو ہی خوشبو بکھر گئی۔ اس کے بعد کنول نے برجیس کو پلنگ پر بٹھا دیا اور خود باہر نکل گئی۔

دوسرے کمرے میں جا کر اس نے تنویر کی تیاری مکمل کی شادی کے دن والا وہی اسے دولہا کا سوٹ پہنایا اور اس کی نوک پلک درست کر کے برجیس کے کمرے کے پاس چھوڑ گئی تنویر اندر آیا اور برجیس کے پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا اور پھر اس کا گھونگٹ اٹھایا۔ قبل اس کے وہ کچھ کہتا برجیس نے اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دیا۔ اور بڑی عقیدت سے تنویر

کے پاؤں چومتے ہوئے کہا۔

"میں بہت بدقسمت تھی جو اپنے شوہر کو خوش نہ رکھ سکی۔"

تنویر نے اُسے شانوں سے پکڑ کر اوپر اُٹھایا۔

"غلط فہمی نے ہم دونوں میں دیوار کھینچ دی تھی برجیس۔ اَب ایسی کوئی بات نہیں"

برجیس کٹے ہوئے درخت کی طرح پھر اس کے پاؤں پر گر گئی اور روتے ہوئے کہا

"میری یہ آخری خواہش تھی کہ میں اپنے شوہر کے قدموں پر جان دوں۔ اَب مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ مجھے میری منزل مِل گئی ہے۔"

تنویر گھبرا گیا۔

"کیا ہو گیا ہے برجیس تمہیں۔"

"میں ——— مَیں اَب جا رہی ہوں بہت دُور سُرخ رُو ہو کے جا رہی ہوں۔"

تنویر نے پھر اُسے سنبھالا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔"

برجیس بے جان سی لاش ہو کر پھر گر گئی۔

"مَیں ——— مَیں بس چند لمحوں کی مہمان ہوں۔ مجھے اپنے قدموں پر مرنے دیجئے میں کنول کی خوشیوں میں شریک نہیں ہونا چاہتی۔ آپ اس کے ہیں اور ہمیشہ اُسی کے رہیں گے۔"

تنویر نے زور سے کنول کو پکارا۔

"کنول!"

کنول دوسرے کمرے سے بھاگتی ہوئی نکلی۔ اور اُن کے کمرے کے باہر ہی کھڑے ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے تنویر!"

تنویر نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"جلدی اندر آؤ کنول!"

کنول اندر آئی۔

تنویر بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"برجیس کو دیکھو کیا ہوا؟"

کنول اُسے ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے لگی۔ برجیس بے جان ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک کنول کی نظر تکیے کے قریب ایک شیشی پر پڑی۔ جس پر موٹے اور سرخ حروف میں لکھا تھا POISON۔

کنول کانپ گئی۔ "اس نے تو زہر کھا لیا ہے۔ جلدی کیجئے۔ اُسے ہسپتال لے چلیں۔"

برجیس جو تنویر کے پاؤں سے لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے کنول کی ساڑھی کا پلو بھی پکڑ لیا۔

"نہیں کنول! مَیں ہسپتال نہیں جاؤں گی۔ میری منزل قریب ہے۔

میری بات سُنو۔ مَیں ——— مَیں نے قیصر بھائی کو پورے حالات لکھ دیے ہیں وہ بہت جلد آ جائیں گے۔ تم دونوں کو قسم ہے میرے بعد اِس گھر کو نہ چھوڑنا۔"

کنول اس سے لپٹ گئی۔

"مَیں ابھی تمہیں ہسپتال لے کے جاؤں گی۔"

برجیس پھیکی ہنسی ہنس دی۔

"پگلی ہے تو۔ مشرقی عورت قربانی دینا جانتی ہے۔ دیوار بننا نہیں جانتی۔ وہ ــــ
وہ ادھر دیکھو کنول ان بکسوں میں تمہاری شادی کے کپڑے اور زیورات میں نے بنا کے رکھے
ہوئے ہیں تم دونوں کو میرے مرنے کے بعد جلدی شادی کر لینا۔ اس طرح میری ــــ
میری روح ــــ سکھ ــــ سکھی رہے " ــ

برجیس ختم ہو گئی۔
کنول اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

"یہ تم نے کیا کیا برجیس"
تنویر بھی رو رہا تھا۔
رونے کی آوازیں سن کر رحمن بوا بھی کمرے میں آئی اور مردہ برجیس کو دیکھ کر دھاڑیں
مارنے لگی۔ کیسا المناک منظر تھا۔

پروین باجی آئی تھی بہت رونی تھی آپ کو یاد کر کر کے۔ بری حالت ہو رہی تھی
بچاری کی۔ مجھ سے یہ حالت نہیں دیکھی جاتی اس کی جب سے امی مری ہیں وہ یہ محسوس
کرنے لگی ہے کہ اب اس دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ آپ کے سامنے وہ نہیں آتی کبھی آپ گھر نہ
ہوں تو آتی ہے اور تھوڑی دیر بیٹھ کر رو دھو کے چلی جاتی ہے ہماری شادی کا پوچھ رہی تھی
میں نے کہا برجیس کے چالیسویں کی وجہ سے رکے ہوئے تھے اب جلدی ہی کریں گے"
گھاس کے میدان میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے تنویر سے کنول نے کہا۔

تنویر نے گردن جھکا لی۔
"کیا ہو سکتا ہے۔ حالات نے اسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ جہاں میں اسے بہن ہوتے
ہوئے بھی بہن کہہ کر نہیں پکار سکتا ہے۔ کون غیرت مند بھائی یہ برداشت کر سکتا ہے کہ اس

کی بہن اِس بازار میں رہے۔"

کنول نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"ہم اسے اپنے گھر کیوں نہ لے آئیں"

تنویر کی آواز بھرا گئی۔

"پورے زمانے میں تشہیر ہو جائے گی کہ فلاں کی بہن ——— تنویر کچھ نہ کہہ سکا

"تو آپ کیا چاہتے ہیں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے"

تنویر کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

"اب کے وہ آئے تو اُسے کہنا۔ تنویر ہاتھ جوڑتا تھا کہ یہ شہر چھوڑ کر کہیں چلی جائے

کنول نے روہانسی آواز میں کہا۔

بہت سنگدل ہیں آپ۔ کہاں جائے وہ۔ اِس بھری دنیا میں نہ اس کا کوئی چارہ ساز نہ غمگسار۔ جائے تو کدھر جائے۔ میں تو کہتی ہوں آپ آج جا کر اسے لے آئیں۔ پرسوں عید ہے ہمارے ساتھ بیچاری عید منائے گی۔ اور اسے احساس ہوگا کہ اِس سنگدل زمانے میں میرا بھی کوئی ہے"

کرمن بوا چائے لے آئی۔ دونوں کو ایک ایک کپ دیا اور چلی گئی۔ کنول نے چائے کی چسکی لی۔

"پھر کیا خیال ہے آپ کا"

تنویر سوچوں میں ڈوب گیا۔

کیا کہوں کنول۔ کس کافر کا جی نہیں چاہتا اس کی بہن ایک اچھے ماحول میں رہے

بھی زندگی بسر کرے اور خوش رہے۔ لیکن

لیکن ——— حالات نے اُسے وہ داغ دیا جو مٹ نہیں سکتا۔

زمانے نے اُسے ایسے زخم لگائے جو مندمل نہیں ہو سکتے

وقت نے اس کے دامن کو کچھ اس طرح جھیر جھیر کر دیا ہے کہ اسے سیا نہیں جا سکتا۔

میں کیا کہوں کنول کیا کہوں۔

معاشرہ ایسی عورتوں کو تہذیب پر دھبہ سمجھتا ہے۔

سوسائٹی کے افراد انہیں ایسے ناموں سے پکارتے ہیں جنہیں ایک شریف انسان کے کان سننا پسند نہیں کرتے میں اس کا سامنا نہ کروں گا۔

تم ——— تم میری طرف سے اسے کہہ دینا۔

کہیں ڈوب مرے یا

یا ——— کچھ کھا کے سو رہے۔

کنول رو دی۔

اس کے کن گناہوں کی سزا ہے یہ؟

کیا قصور ہے اس بیچاری کا۔

کون سا جرم کر بیٹھی ہے وہ

یہی نا

اسے زبردستی اغوا کر کے اِس بازار پہنچا دیا گیا۔

حالات خود مجرم ہیں جنہوں نے اُسے داغ لگائے۔

زمانہ خود گنہگار ہے جس نے اُسے زخم دیے۔
وقت خود کج رو ہے جس نے اُس کی عصمت کا دامن جھیر جھیر کر ڈالا۔
کنول کے تیور بدل گئے اور وہ غصّے میں آگئی۔
آپ ہی بتائیے نا
کون ہے مجرم
کون گنہگار ہے۔
کس نے اپنے ہاتھوں کی بُرائی سے اس کا منہ لتھڑ دیا۔
جواب دیں نا آپ چپ کیوں ہیں۔
اس کے موجودہ حالات کے ذمہ دار ہیں وہ ——————
وہ مرد جو اپنے بدی کے تصوّر کی طرح سیاہ ہاتھوں سے معصوم پھُولوں کو کانٹوں میں اُلجھا دیتے ہیں۔
گناہ کی خواہش کی طرح ذلیل ترین، بے حیا اور بے شرم وہ مرد جو کسی کی بہو بیٹی کو ماں باپ، بہن، بھائی اور اپنے گھر تک سے جدا کر کے گناہ کی بھٹی میں جھونک دیتے۔
اب بھی آپ کہیں گے وہ گناہ گار ہے؟۔
وہ بچاری تو گھر سے آپ کو کھلانے کے لیے نکلی لیکن خبر نہیں کن نابکاروں نے اُسے اٹھا کر اس جہنم کے سے بازار کے ٹھیکیداروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور وہاں حالات نے اُسے ایک گرہستن لڑکی کے بجائے رقاصہ بنا دیا۔ جو کچھ ہوا سب اس کی مرضی اور خواہش کے خلاف ہوا۔ اَب بھی آپ کہیں گے کہ میں اس کا سامنا نہ کروں گا۔ اور اس بے قصور

ی کی بھٹی سے آپ نجات نہیں دلوائیں گے تو اور کون ہے اس کا جو پُرسانِ حال بنے
ے آج اُسے کہا بھی تھا کہ میں تنویر کو ضرور بھیجوں گی تمہیں لانے کے لیے وہ کہہ رہی تھی
ساتھ ایک اور لڑکی بھی ہے جو وہاں سے چھٹکارا چاہتی ہیں۔ کئی بار ہم نے بھاگ
مگر کامیاب نہ ہوئیں۔
تنویر نے گردن اُوپر اُٹھائی۔
تم کہتی ہو تو آج شام کو جا کر اُسے ضرور لے آؤں گا‘‘
کنول خوش ہو گئی۔
شکر ہے خدا کا۔ آپ نے ہاں تو کی۔ بچاری ہمارے ساتھ رہے گی۔ اور عزت کی خوش
ندگی بسر کرتی رہے گی‘‘
تنویر نے گھڑی دیکھی۔
چ تو بج ہی گئے ہیں۔ مَیں کپڑے بدلتا ہوں اور جا کر لے آتا ہوں اُسے‘‘
ایک اور بات بھی بتاؤں آپ کو؟‘‘
وُہ کیا؟‘‘
آپ کی آنکھوں کا آپریشن ہونے سے قبل آپ کے پاس عاصیہ نام کی ایک لڑکی
تی تھی نا۔‘‘
ہاں ہاں کیا ہُوا اُسے‘‘
ہونا کیا ہے بچاری کو۔ وُہ پروین ہی تھی اور نام بدل کر آپ کی خدمت کرتی رہی‘‘
تنویر کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

"آخر بہن ہے۔ محبت تو اُسے مجھ سے ہے ہی۔"

"چلیئے اُٹھیئے پھر کپڑے بدل لیجیے۔"

"چلو۔"

دونوں گھاس کے پلاٹ میں لگی کرسیوں پر سے اُٹھے اور اندر چلے گئے کریمن بُو زور شور سے کھانا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ پرجبیں کے بعد اب کنول اس کی توجہ کا مرکز تھی۔ اور اُسے وہ اپنی بیٹی کی طرح چاہنے لگی تھی۔ گو وہ ملازمہ تھی مگر تنویر یا کنول میں سے کسی نے بھی کبھی اس سے ملازموں سا سلوک نہ کیا تھا۔

شام ہوتے ہی سبھی طوائفوں کے کوٹھوں کی بہتابیوں پر چھڑکاؤ ہو گیا۔ طبلے بجنے لگے اور گھنگھرو جھنجھنانے لگے۔ خوب رونق ہو رہی تھی۔ تنویر آج پہلی بار اِس بازار میں گھوم رہا تھا گلی میں کھڑے ایک لڑکے سے اُس نے کچھ پوچھا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک مکان میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل پر آ گیا سامنے ایک صاف ستھرا کمرہ تھا جس کے باہر ی کا مخملی جوتا پڑا تھا۔

کمرے میں شبِ مہتاب کا عالم تھا۔ پورے کمرے میں چاندنی کا فرش تھا۔ ان گنت گلوب روشن تھے۔ دیواروں پر جا بجا جلی آئینے تھے۔ وسط میں سر جھاڑ منہ پھاڑ قسم کی ایک گھاگ عورت بیٹھی تھی۔ جس کے دائیں ایک نقشی پاندان اور سامنے اُگالدان پڑا تھا۔

اس کے سامنے ذرا ہٹ کے ایک صاحب گلبدن کا پاجامہ اور مصالحہ کی ٹوپی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ شاید رقص دیکھنے آئے ہوں گے۔ اس کے قریب استاد قسم کا ایک مرد طبلہ بجا بجا کر اپنی بھدی آواز میں گا رہا تھا۔

جانت ہوں جانت ہوں

مَیں تو سب جانت ہوں

تنویر یہ سماں دیکھ کر کچھ دیر دنگ کھڑا رہا۔ پھر اندر داخل ہوا اور طبلہ بجانے والے اُستاد سے پوچھا۔

پروین نام کی کوئی لڑکی یہاں ہے۔

اِس طبلچی نے ایک بار، ذرا غور سے تنویر کو دیکھا پھر انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

اِس ساتھ والے کمرے میں ہے۔

تنویر آگے بڑھ گیا۔

اِس گھاگ عورت نے اُستاد قسم مرد کو گھرکا۔

کیوں جانے دیا تم نے؟"

اِس نے طبلہ بجانا بند کر کے بازاری انداز میں کہا۔

"کیا ہوا بائی جی ہو سکتا ہے اس کا کوئی باہر ملنے والا گاہک ہی ہو۔"

اس گھاگ عورت نے خدشہ ظاہر کیا۔

اگر کوئی ایسا ویسا ہوا تب۔"

اوہ واہ بائی جی تم بھی حد کرتی ہو ایسا ویسا ہوا تو نکال باہر کریں گے۔ ویسے آدمی کوئی ایک دکھائی دیتا ہے جیب بھی نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔"

بائی جی کے منہ میں پانی بھر آیا۔

تم نے دیکھی۔"

ہاں تو اور کیا۔ میرا دھیان ہی ایسی چیزوں کی طرف رہتا ہے۔"

پھر بیٹھک ملنے دو۔ جتنی دیر چاہے بیٹھے۔ رات رہنے والی اسامی ہوئی پھر تو مزے رہیں گے۔"

تنویر اس کمرے میں داخل ہوا اور پروین اس کی طرف پشت کئے کرسی پر بیٹھی امرتیاں کھا رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے کانی سے نازک نازک چھریرے بدن پر پشواز پہنے ہوئے تھی۔ گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ ناک میں ہیرے کی کیل تھی اور سر پر کاٹی کریپ کا ڈوپٹہ تھا۔

تنویر ابھی تک دروازے میں ہی کھڑا تھا۔ آخر ہچکچاتے ہوئے اُس نے کہا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں؟"

پروین نے مڑ کے دیکھا۔

اُف خدایا۔ اس کی حالت

جسم سے گویا کسی نے سارا خون نکال لیا ہو۔

وہ کھڑی ہو گئی۔

وحشت سے اُس کی گھگھی بندھ گئی جس کے باعث وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔

تنویر آگے بڑھا اور کمرے کے وسط میں آ کے کھڑا ہو گیا۔ پروین کو اچانک کوئی بات سوجھی۔ تیزی سے آگے بڑھی اور دروازہ اندر سے بند کر کے ایک طرف ہٹ کے کھڑی ہو گئی۔

تنویر پھر بولا۔

ارا ہی نام پروین ہے۔"

روین جھجکی رہی۔ وہ اپنے جسم میں جان تک محسوس نہ کر رہی تھی بس سُن ہوئی جا رہی

ریوں"

ے اس کے خون کی حرکت بند ہو گئی ہو اور پورا بدن برف کی قاش بن گیا ہو۔ تنویر

پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

ں نے تم سے کیا پوچھا ہے"

روین رو پڑی

ں باپ نے تو نام پروین ہی رکھا تھا لیکن یہاں آ کر زہرہ بائی بن گئی۔

م بدل جانے سے تقدیر بھی بدل گئی۔

روین ہی رہتی تو شاید یہ دین و دنیا کی روسیاہی نہ ہی ملتی۔

روین بری طرح رونے لگی۔

ویر پگھل کر رہ گیا۔

ہت بدنصیب ہو

بدنصیب نہ ہوتی تو ماں باپ اور بھائی سے بچھڑ کر اس اندھے کنوئیں کیوں آگرتی۔"

ہی بھی تم وہاں جہاں تمہاری ماں اور بھائی تھے۔"

ہچکیاں لیتے ہوئے پروین نے ڈوپٹے سے آنسو پونچھے۔

بس قصور ہوا۔"

"تنویر کے پاس عاصیہ کے روپ میں تم ہی جاتی رہیں۔"

پروین کا پورا بدن کانپ گیا۔

میں بیشک طوائف سہی لیکن اپنی ماں جائے کو کیسے بھول سکتی ہوں۔ وہ میر
ماں باپ کا خون ہے۔ اور اپنا خون جہاں بھی ہو اس کی خوشبو آ جاتی ہے۔"

تنویر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جنہیں اس نے چھپا لیا۔

لیکن ہائے۔

پروین اس کے آنسو دیکھ چکی تھی۔

پگھل گئی بیچاری

آگ لگ گئی بدن میں۔

بھائی کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ جا رہی تھی۔ بڑی بہن جو تھی۔ چھوٹے بھائی کے
محبت کا جوش مارنا ضروری امر تھا۔ اس کا جی چاہا کہ سب کچھ بھول جائے۔ اور اپنے
سے لپٹ کر اسے اِس قدر پیار کرے اس قدر پیار کرے کہ سبھی غم بھول جائے۔

لیکن ہائے ری مجبوری۔

ایک تو رنڈی ہونے دوسری پیشواز پہنے ہونے کا احساس مارے ڈال رہا تھا

تنویر پھر بولا۔

"شاید تمہاری طرح تمہارے بھائی کو بھی تم سے محبت ہو۔"

پروین کی حالت لمحہ بہ لمحہ بری ہوتی جا رہی تھی۔

"یہ تو میری خوش بختی ہے۔"

وہ تمہیں لینے آئے پھر؟"

روین اور زیادہ رو دی۔

یں نگوڑ ماری اتنی خوش نصیب کہاں۔"

تنویر نے اپنے آنسو پونچھے۔

یقین جانو تمہارا بھائی تمہیں لینے آیا ہے۔ اور میں اپنی بہن سے پوچھتا ہوں کیا وہ
ساتھ چلے گی۔"

پروین بھاگ کر تنویر سے لپٹ گئی۔

بھیّا! ایک دفعہ پھر بہن کہو۔"

تنویر بھی اس سے لپٹ گیا۔

میری اچھی باجی۔"

پروین اور سختی سے چمٹ گئی،

ایک بار پھر باجی کہو تنویر! خدا کے لیے کہو۔ میں ترس گئی ہوں اِس نام کو۔"

تنویر رو پڑا۔

میری اچھی بہن۔ میری اچھی باجی۔"

دونوں بہن بھائی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

ناگاہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں بہن بھائی جدا ہو گئے۔ پروین نے
زہ کھولا۔ ایک ہٹا کٹا مرد تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے پوچھا۔

"کون ہے یہ؟"

پروین خوف سے کانپ گئی۔

تنویر نے جواب دیا۔

"میں اس کا بھائی ہوں"

"یہاں تمہارا کیا کام ہے؟"

"میں اسے لینے آیا ہوں"

ابے جا۔ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی چل خسکا کھا"

تنویر پھر بولا۔

"تم نے اسے کتنے میں خریدا تھا"

"پانچ سو میں"

"میں پانچ ہزار دیتا ہوں"

"اوں ہوں"

"دس ہزار"

"بیس ہزار دو تو بھی نہ جانے دوں"

"پھر مجھے زبردستی لے جانا ہوگا۔"

"اتنی ہمت ہے"

"ہاں" تنویر آگے بڑھا اور پروین کا بازو پکڑ کر باہر لے جانے لگا۔ لیکن اس۔ راستہ روک لیا۔ تنویر طیش میں آگیا تھا۔ پھر ایک فولادی گھونسہ اس کے بائیں جبڑ پر داغ دیا۔ بھڑوا ایک دفعہ چکرایا۔ پھر بے جان کٹے کی طرح فرش پر گر گیا۔ تنویر نے اس

کیا خیال ہے لے جا سکتا ہوں"

اتنے میں ایک اور دیوث اندر آگیا۔ تنویر دونوں کو جڑ گیا اور لاتوں گھونسلوں سے اُن ب خبر لی۔ دونوں دلال ہانپنے لگے باہر بیٹھی ہوئی وہ گھاگ عورت بھی اپنا لہنگا جھاڑتی وہاں آگئی وہ بڑ بڑا رہی تھی۔ جیسے ابھی ابھی کھرے کھاٹ پر سو کے اُٹھی ہو۔ اپنے دونوں ں کو جو اُس نے بُری طرح پٹتے دیکھا تو ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"اے ہے خدا غارت کرے یہ مُوا کہاں سے آگیا۔

وُہ تنویر کو دھنفر مارنے لگی۔

تری ایسی تیسی نکل یہاں سے"

پروین کو غصّہ آگیا اور بڑھیا کو زور کا دھکا دے کر دُور گرا دیا۔

دونوں دلال بُری طرح پٹ رہے تھے۔

اتنے میں ان کا کوئی اور ساتھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پسٹل تھا۔ آتے ہی اُس نے نویر کو حکم دیا۔

"ہاتھ کھڑے کر لو ورنہ گولی مار دوں گا"

تنویر نے ہاتھ اُوپر کر لیے۔

نَووارد نے پروین کا بازو پکڑ لیا۔

"چلو تم دوسرے کمرے میں"

پروین بِپھر گئی۔ اور اپنا بازو چھڑا لیا۔

"میں تھوکتی ہوں تمہارے جنم پر"

اچانک کمرے کی کھڑکی کے باہر سے کسی نے فائر کیا۔ اور پسٹل والا دیوٹ لہرا
نہاکر فرش پر گر گیا۔ دو گولیاں لگاتار اور آئیں اور باقی دونوں بھڑوے بھی ختم ہو گئے
سیکنڈ کا وقفہ ہوا اور پھر ایک گولی آئی وہ گھاگ عورت بھی ڈھیر ہو گئی۔ تنویر نے جلدی
موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھایا اور پروین کا بازو پکڑ کر باہر نکلا۔ بڑے کمرے
باہر آکر دونوں بہن بھائی تقریباً بھاگتے ہوئے سیڑھیاں اُترنے لگے۔

کنول بڑی بے چینی سے تنویر کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی کریمن بُوا بھی اس
پاس بیٹھی تھی۔ باہر تھوڑا سا بھی کھٹکا ہوتا وہ چونک پڑتیں۔ کافی دیر تک انتظار کرتی رہیں
کوٹھی میں کار داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ دونوں جلدی جلدی باہر آئیں۔ کار پورٹیکو میں
رُکی۔ وہی برجیس والی کار تھی تنویر اور پروین ایک ساتھ اِس میں سے اُترے
کنول بھاگ کر آگے بڑھی اور پروین کو گلے لگا لیا۔ کریمن بُوا نے بھی اس کے سر پر ہاتھ
پھیرا۔ پھر دونوں اُسے ساتھ لے کر ایک کمرے میں چلی گئیں تنویر کی قمیض دونوں شانوں سے پھٹی
ہوئی تھی۔ چپ چاپ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔
پروین پیشواز میں اپنے آپ کو بہت بُرا محسوس کر رہی تھی۔ کمرے میں آتے ہی اس
نے کنول سے کہا۔

"کنول! مجھے پہننے کو کپڑے تو دو۔ اس لعنت کو تو اتار دوں اب۔ کنول نے ایک نیا ساڑھی اور بلوز نکال کر دیئے۔"

پروین ہچکچائی۔

"یہ نہیں کچھ معمولی کپڑے دو کنول!"

کنول نے پیار میں ڈانٹ پلا دی۔

"دوبارہ ایسی بات نہ کہنا باجی۔ بس اب جلدی لباس بدلو۔"

کریمن بوا بھی کنول سے مخاطب ہوئی۔

"میں کھانا لگاؤں بٹیا؟"

کنول نے پروین کا ڈوپٹہ لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"لگاؤ لگاؤ بوا"

کریمن باہر نکل گئی۔

پروین لباس بدلنے لگی۔

"کنول! تنویر کی قمیض پھٹ گئی تھی۔ تم جاکر اسے دوسرے کپڑے تو پہننے کو دو۔"

کنول تنویر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اُداس سا بیٹھا ہوا تھا۔ کنول نے پیار سے پوچھا۔

"کیا بات ہے؟ اُداس کیوں ہو گئے۔ زیادہ جھگڑا ہو گیا کیا؟"

تنویر زبردستی مسکرا کر ٹال گیا۔

"نہیں بس معمولی ہاتھا پائی ہوئی تھی اور میں پروین کو لے آیا۔"

کنول نے اسے نئی قمیض نکال کر دی۔

"شکر ہے زیادہ جھگڑا نہیں ہوا۔ میں تو بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ چلئے اُٹھیے وہ قمیض اتار کر یہ پہن لیجئے۔"

تنویر نے چپ چاپ اُٹھ کر دوسری قمیض پہن لی۔ کنول اس کو ساتھ لے کر باہر آئی۔ دوسرے کمرے سے پروین کو بھی لیا۔ اور تینوں کھانے کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

تنویر کھانا کھا کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کنول اور پروین وہیں بیٹھی تھیں کریمن بوا برتن سمیٹنے لگی تھی پروین کو کوئی بات سوجھی۔

"پرسوں عید ہے نا کنول!"

کنول اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ہاں باجی! پرسوں عید ہے۔"

"پھر میرے خیال میں مجھے کل ہی انتظام کرنا پڑے گا۔"

کنول نے ذرا جستجو سے پوچھا۔

"کاہے کا بندوبست باجی؟"

"تنویر اور تمہاری شادی کا"

کنول کچھ شرما گئی۔ چپ ہی رہی بچاری۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"اتنی جلدی کیا ہے عید کے بعد سہی۔"

نہیں۔ میں عید سے پہلے ہی تم دونوں کی خوشی دیکھنا چاہتی ہوں۔ کل تم میرے ساتھ بازار چلنا۔ شادی کی ضروری ضروری چیزیں لے آئیں گے۔"

"وہ تو پرجبیں بچاری ہر چیز بنا کے رکھ گئی ہے۔"

"چلو اٹھو مجھے دکھاؤ تو سہی۔"

کنول کھڑی ہو گئی۔

"آئیے۔"

دونوں ایک ساتھ ڈرائینگ روم سے باہر نکل گئیں۔

دوسرے روز صبح سویرے تینوں ناشتہ کر چکے تو پروین نے تنویر سے اس موضوع پر بات چیت شروع کی۔

"کہیں باہر جاؤ گے تنویر!"

تنویر نے بغیر کسی دلچسپی کے یوں ہی کہا۔

"ذرا مل جاؤں گا باجی! وہاں تھوڑی دیر کام کی نگرانی کرنے کے بعد بازار جاؤں گا۔ کچھ دوکانداروں سے پچھلے مہینے کا کرایہ بھی لینا ہے۔ کیوں کوئی کام ہے آپ کو؟"

"کام تو ہے اندازاً کتنے بجے تک لوٹ آؤ گے؟"

"کیا خبر شام کو ہی آؤں۔ آپ کام کی نوعیت تو بتائیے نا؟"

"تین بجے سے پہلے ہی آ جانا پھر۔ میری صلاح ہے تم دونوں کا آج نکاح ہو جائے گا کریمن بوا کو میں نے سب کچھ سمجھا دیا ہے میرا تو خیال ہے نہ ہی جاؤ آج باہر۔"

تنویر مسکرا دیا اور کنکھیوں سے کنول کی طرف دیکھا۔

"کنول سے پوچھا آپ نے؟"

"اس نے کیا کہنا ہے۔"

"آپ پوچھیں تو سہی۔"

پروین ہنس پڑی۔

"بتاؤ بھئی کنول۔"

کنول نے سر جھکا لیا۔ اس کے چہرے پر گہری شفق پھول گئی تھی۔

تنویر نے ٹیبل کے نیچے سے کنول کی ٹانگ کو پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔

"کیوں مارتے ہو بچاری کو۔ وہ بھلا اپنی شادی کے متعلق کیا کہے گی۔" پروین اٹھی اور کنول کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اٹھو کنول ہم چلیں اپنے کمرے میں۔"

کنول کھڑی ہو گئی۔

پروین اسے اپنے ساتھ لے جاتی ہوئی تنویر سے مخاطب ہوئی۔

"اب سارا دن تمہیں اس کا چہرہ نہ دیکھنے دوں گی۔"

تنویر کے لبوں پر گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔ کنول اور پروین باہر نکل گئیں۔

سہ پہر کے قریب پروین نے پہلے کنول کو بنا سنگار کر کے دلہن بنایا اس کے بعد تنویر کی نوک پلک درست کر کے دولہا بنا دیا۔ اور شام سے کچھ پہلے نکاح ہو گیا۔ کنول اپنے کمرے میں اپنی پوری سج دھج کے آراستہ پیراستہ کرسی پر بیٹھی تھی پروین بھی اس کے پاس تھی۔ تنویر اپنے کمرے میں تھا پروین اس وقت کسی کام سے صحن کی طرف گئی تنویر

نے اُسے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ اُسے فوراً شرارت سوجھی۔ اپنے کمرے میں پڑی ہوئی
مٹھائی کے لفافوں میں سے جلدی جلدی مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور درمیانی دروازہ کھول کر
کنول کے کمرے میں آیا۔ کنول نے جونہی اسے دیکھا اس کا دِل دھڑکنے لگا۔ حالانکہ وہ دن
رات اِسی کے پاس رہتی تھی۔ لیکن یہ موقع ہی ایسا تھا کہ اس کا دل بے قابو ہو گیا۔ تنویر نے سرگوشی
میں پوچھا۔

" میں اندر آسکتا ہوں "

کنول نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپکی ہو رہی اور سر جھکا لیا۔

تنویر بدحواس سا ہو کے بولا۔

" اوہو۔ باجی نے تو کہا تھا دن کو تمہارا مُنہ نہیں دیکھنا۔ اچھا یوں ہی سہی "

وہ اُلٹے پاؤں کنول کی طرف بڑھنے لگا۔

کنول ہنس دی

تنویر اس کے پاس آکر رُک گیا۔ اَب بھی وہ اس کی طرف پشت ہی کئے ہوئے تھا۔
اور یوں کھڑے کھڑے اُس نے اپنا ہاتھ پیچھے بڑھایا۔ اس میں مٹھائی تھی۔ دھیرے سے
اُس نے کہا۔

" مُنہ کھولو کنول! "

کنول اسی طرح بیٹھی رہی۔ بالکل نہ ہلی جلی۔

تنویر نے دوسرے ہاتھ سے اس کے سر پر ٹھوکر لگائی۔

" کھولو نا مُنہ "

کنول پھر بھی نہ ہلی۔

تنویر نے پھر کہا۔

" دیکھئے کسی کا دِل توڑنا اچھی بات نہیں "

کنول کے جسم میں حرکت ہوئی پھر

پھر ——— اُس نے اپنا مُنہ کھول کر آگے بڑھا دیا۔

تنویر نے مٹھائی اُس کے مُنہ میں ڈال دی اور پیار سے گال پر ہلکی سی چپت بھی
ئی۔

" شادی مُبارک "

کنول نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

اچانک باہر کھٹکا ہوا۔ پروین برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

تنویر گھبرا گیا۔

اوہو! باجی آگئیں۔

جلدی جلدی اُس نے اپنے جوتے اُتار کر بغل میں دبا لیے اور اپنے کمرے کی طرف
ل گیا۔ کنول اس کی اس حرکت پر اس قدر ہنسی اس قدر ہنسی کہ اس کے پیٹ میں بل
گئے۔

رات آگئی اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ۔ وہی کمرہ تھا۔ جس میں پرسوں دو بار
ن بن کے بیٹھی تھی۔ پلنگ بھی وہی تھا۔ اور آج اِسی کمرے میں اور اسی پلنگ پر
ہ سرخ گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور تنویر اندر آیا وہ چپ چاپ

اس کے پلنگ پر بیٹھ گیا اور بڑے غور سے اُسے دیکھنے لگا۔ کافی دیر تک وہ اسی طرح بیٹھا اُسے تکتا رہا۔ کنول پریشان ہوئی جارہی تھی۔ دو ایک بار گھبراہٹ میں اس نے اپنے آپ کو سمیٹ کر اپنا سرخ غرارہ سوٹ بھی سنبھالا۔ تنویر کی تیز نگاہیں اس کے نازک بدن میں کھُبی جارہی تھیں۔ آخر تنویر کے ہاتھ آگے بڑھے اور کنول کا گھونگھٹ اُٹھ گیا۔ کنول بچاری کا نازک نازک جسم کانپ رہا تھا۔ تنویر گہری آواز میں بولا۔

کنول

کنول نے مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ البتہ سر اور زیادہ جُھک گیا۔

تنویر پھر شرارتی بن گیا۔

ارے کیا ہوگیا تمہیں۔ شادی سے پہلے تو ایسے چہک چہک کر مجھ سے باتیں کرتی تھیں۔ اور اَب تم نے چُپ ہی سادھ لی ہے۔ شادی کیا ہوئی تم تو اجنبی ہی ہوگئیں۔

کنول اُونچے اُونچے سانس لے رہی تھی۔

تنویر نے اس کا چہرہ اوپر اُٹھایا۔

نانا شادی کے بعد اور زیادہ حسین ہوگئی ہو۔ لیکن مجھ سے تو بات کرونا۔

کنول نے آنکھیں موندھ رکھی تھی۔

تنویر اس کا چہرہ یوں ہی دیکھتا جارہا تھا۔

اچانک کنول نے اپنا جسم تنویر کی گود میں گرا دیا اور اس کا سر خود بخود تنویر کی چھاتی سے لگ گیا۔ تنویر کو اُس کی یہ ادا بڑی بھلی لگی۔ دھیرے سے وہ مُسکرا دیا۔ رات ہلکی ہلکی سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی سِسک سِسک کر گزرتی ہی چلی گئی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ

دلوں میں اُٹھتا ہُوا طوفان بڑھتا ہی چلا گیا۔

دوسرے روز تنویر صبح سویرے غسل خانے میں نہا دھو کے جب کمرے میں آیا تو کنول آئینے کے سامنے کھڑی بن سنور رہی تھی کہ تنویر اس کے پاس جا کھڑا ہوا اور پیار سے

"کیسے ہیں حضور!"

کنول مُسکرا دی۔

"ٹھیک ہوں۔"

تنویر کو کوئی بات یاد آگئی۔ اور اُس نے کنول کا کان پکڑ لیا۔

"ارے اب تو تم خوب چہکنے لگی ہو۔ رات تو تم اپنے حواسوں میں ہی نہ رہی تھی۔"

کنول نے اُس کے چپت لگا دی۔

"شریر کہیں کے!"

"ارے کنول عید ہے آج تو۔ عید مبارک اور ہاں شادی بھی مُبارک۔

کنول نے اپنی شیریں آواز میں کہا۔

"عید مُبارک جمع شادی مُبارک۔"

دونوں ہنس پڑے۔ اچھا کنول جلدی جلدی میری تیاری کراؤنا۔"

کنول نے اس کے سر کو تیل لگایا۔ کنگھی کی۔ کپڑے بدلوائے نیا جوتا پہنایا۔ قمیض کے درست کئے اور پیچھے ہٹ کے دیکھا۔

"بس۔"

تنویر نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

" ذرا اِدھر آنا "

وہ اُسے آئینے کے سامنے لے گیا۔ اور اس کے گال کے ساتھ اپنا گال ملاتے ہوئے پُوچھا۔

"اب بتاؤ اِس لڑکی اور لڑکے کا جوڑ کیسا رہے گا "

کنول نے اُس کی چھاتی پر سر رکھ دیا۔

بہت اچھا جوڑ ہے۔"

تمہیں پسند ہے یہ چھوکرا "

" ہاں "

" شکر ہے "

باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دونوں علیحدہ ہو گئے پروین اندر آئی۔ تنویر اور کنول نے جھٹ ایک ساتھ کہا۔

" عید مُبارک باجی "

پروین جواب دیتی ہوئی آگے بڑھی اور تنویر سے کہا۔

" تم ابھی تک عید پڑھنے نہیں گئے تنویر! "

" بس ابھی گیا باجی! جلدی جلدی تنویر باہر نکل گیا۔

کنول کمرے کی اِدھر اُدھر بکھری چیزیں ٹھیک کرنے لگی اور پروین جا کر کریمن بُوا کے ساتھ باورچی خانے میں ہاتھ بٹانے لگی۔

کچھ دیر تنویر عید پڑھ کے آ گیا۔ کنول کمرے میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

تنویر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

باجی کدھر ہیں!

ڈائننگ روم میں کھانا لگوا رہی ہیں۔ بس اب ہم دونوں کا ہی انتظار کر رہی ہوں گی "

چلو اُٹھو پھر "

کنول کھڑی ہو گئی۔

چلیں ؟ "

تنویر بھی اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ارے نہیں گلے ملیں "

کنول نے تیز نگاہوں سے دیکھا۔

وہ کس خوشی میں "

ابھی عید ہے آج "

اور کنول آگے بڑھی۔

یوں نہیں پہلے بازو پھیلاؤ اپنے "

کنول نے بازو پھیلائے۔ اور

اور ——— دونوں گلے مل گئے۔

کنول نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

" دیں کیا عیدی دیتے ہیں "

تنویر نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ بس یا اور کچھ بھی چاہیئے؟"

کنول سختی سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

"بس مجھے آپ کے پیار کے علاوہ کچھ نہیں چاہیئے"

لاؤ مجھے دو پھر عیدی" تنویر نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ کنول نے بھی اس کا ہاتھ چوم لیا۔ دونوں خوشی میں جھوم جھوم گئے۔

کنول علیحدہ ہو گئی۔

"چلئے کھانا کھائیں چل کے"

تنویر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آؤ"

دونوں کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ پروین اور کریمن بوا برتن جانے کے بعد کھانا لگا چکی تھیں۔ تنویر کھانے کی خوشبو سونگھنے لگا۔

"دل خوش کر دیا ہے باجی آج۔ کریمن بوا بھی تھک گئی ہوں گی محنت کر کر کے" پھر وہ ایک ایک کھانا دیکھنے لگا۔

پلاؤ تھا۔

بورانی۔ مزعفر۔ متنجن۔ سفیدہ اور شیر برنج تھے۔

کباب، اچار، دہی۔ بالائی اور نورتن چٹنی بھی تھی۔

سب بیٹھ کر کھانا شروع ہی کرنے لگے تھے کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کسی نے دستک دی۔

کریمن بوا نے جا کر دیکھا اور پھر واپس آکر تنویر سے کہا۔

"باہر پولیس آئی ہے اور آپ کا پوچھ رہے ہیں"

کنول اور پروین نے یک زبان ہو کے کہا۔

"پولیس؟"

تنویر باہر آیا۔ کنول اور پروین بھی اس کے پیچھے آگئیں۔ باہر ایک انسپکٹر اور تین سپاہی کھڑے تھے۔ تنویر کو دیکھتے ہی انسپکٹر نے پوچھا۔

"تنویر آپ ہی کا نام ہے"

"جی ہاں"

"زہرو بائی اور اس کے تین آدمیوں کو آپ نے ہی قتل کیا تھا"

"ہرگز نہیں"

خیر ہم نے تو اپنا فرض پورا کرنا ہے" اس نے سپاہیوں سے کہا۔

"گرفتار کر لو"

سپاہیوں نے ہتھکڑی لگا لی۔

تنویر بیچارہ گھبرا گیا۔

"لیکن کس جرم میں۔ میں نے تو کوئی قتل نہیں کیا"

"یہ تو آپ عدالت میں جا کے کہیں گے انسپکٹر نے کہا۔

پروین رونے لگی تھی۔ اور کنول اف میرے اللہ سرسوں کی طرح پیلی پڑ گئی تھی۔ بس ٹکر ٹکر تنویر کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکل رہی تھی۔ کیا امید تھی، بچاری کو

کہ اس کی خوشیاں پل بھر کی ثابت ہوں گی۔

تنویر کو جب گرفتار کر کے لے گئے تو کنول دھم سے پکے فرش پر گر گئی۔ اور کریمن بُوا اُسے اٹھا کر اندر لے گئیں۔

سکینہ کا بڑا لڑکا اور فرخندہ کا بھائی منیر جو وکیل تھا آج سہ پہر خوش خوش سا کچہری
تا۔ سکینہ، فرخندہ اور امتیں لان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھی اُن کے پاس آ کر
یا۔ بار بار وہ مسکرائے ہی جا رہا تھا۔ سکینہ نے آخر وجہ پوچھ ہی لی۔

کیا بات ہے بیٹا۔ بہت خوش ہو آج"

منیر کھُل کے مسکرا دیا۔

ہاں امی! بس یوں سمجھو ہمیں بہت بڑا خزانہ مل گیا۔"

کچھ بتاؤ تو"

ہمیں اپنی گمشدہ بہن کا سراغ مل گیا۔

کون۔ نسیمہ کا کہہ رہے ہو؟"

"ہاں"

سکینہ بیتاب ہو گئی۔

"کہاں ہے میری بچی جلدی بتاؤ منیر۔"

"اتنی بیتابی کیا ہوئی امی! پہلے آپ وہ لاکٹ لائیں جو فرخ بچپن میں پہنا کرتی تھی"

فرخندہ اُٹھی بھاگتی ہوئی اندر گئی اور لاکٹ اُٹھا لائی۔

"یہ لیجیے بھائی جان" لاکٹ اُس نے منیر کے سامنے میز پر رکھ دیا۔

منیر نے ایک لاکٹ اپنی جیب سے نکالا اور بغور دیکھتے ہوئے ان کا جائزہ لینے لگا۔ دونوں لاکٹ سائز اور بناوٹ میں ایک جیسے تھے۔ منیر خوش ہو گیا۔ دونوں میں ایک ایک تصویر تھی ایک میں تو سکینہ کی جوانی اور فرخندہ کے بچپن کی فوٹو تھی۔ دوسرے میں بھی سکینہ کی طرف بڑھا دیے۔

"دیکھو امی!"

سکینہ دیکھنے لگی۔ فرخندہ اور انیس بھی غور سے جائزہ لینے لگے۔

سکینہ خوشی میں پھول گئی۔

"یہی لاکٹ تو میری نسیمہ کے گلے میں تھا۔ جب وہ گم ہوئی تھی جلدی بتاؤ۔

"تم نے کہاں سے لیا"

"بتاتا ہوں امی بتاتا ہوں دم تو لینے دیجیے"

فرخندہ مچل گئی۔

"جلدی کیجیے بھائی جان ہم ابھی لے کے آئیں گے اسے۔"

انیس بھی بیتاب ہوا جا رہا تھا۔

اب کہہ بھی چکیے نا بھائی صاحب۔ اتنی دیر بھی کیا ہوئی۔

بھئی تم لوگ سنو تو" منیر نے کہا۔

کئی دنوں سے میرے پاس ایک کیس ہے۔ ایک لڑکی کے شوہر پر چار آدمیوں کے الزام ہے۔ وہ لڑکی بچاری کیس لڑ رہی ہے۔ بہت پریشان اور غمگین رہتی ہے حالات ل کہ اس کا شوہر بے گناہ ہے اور اُس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ لیکن عدالت کو کون سمجھائے رف قانون کی زبان سمجھتی ہے۔ بچاری جب بھی آتی ہے رو پڑتی ہے آج اُس نے جب پنے نکال کر دیے تو اس کے پرس سے یہ لاکٹ گر گیا۔ اسے پتہ نہ چلا تھا۔ میں اٹھا کر دینے لگا تھا کہ میری نگاہ اس فوٹو پر پڑی۔ اور میں نے آپ لوگوں کو دکھانے کی خاطر سے چھپا لیا۔"

انیس نے جھٹ پوچھ لیا۔

اس کا نام نسیمہ ہی ہے نا بھائی جان"

منیر کچھ اُداس ہو گیا۔

نہیں نام تو اس کا کنول ہے۔

فرخندہ نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے نام دوہرایا۔

کنول؟"

ہاں"

وہی گوری سی خوبصورت اور لمبے قد کی لڑکی ہے نا بھائی جان۔ جسم نہ پتلا ہے نہ ہی

موٹا۔ بال بھی خوب لمبے لمبے ہیں"

منیر کی آنکھیں چمک گئیں۔

ہاں ہاں بالکل وہی ہے۔ تم کیسے جانتی ہو اسے"

"میری وہ کلاس فیلو تھی"

سکینہ نے غمگین لہجے میں کہا۔

"وہ اگر میری نسیمہ ہے تو میں کون سا منہ لے کر اس کے سامنے جاؤں گی"

منیر پریشان ہوگیا۔

کیوں امی جان!"

"فرخندہ ایک دن اُسے یہاں بھی لائی تھی۔ مجھے دکھانے کے لیے انیس اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے اسے غریب جان کر انکار کر دیا اس نے فرخندہ کے مُنہ پر تھپڑ بھی دے مارا تھا۔ وہ خود انیس سے شادی پسند نہ کرتی تھی۔ فرخندہ سے اس نے کہا تھا کہ میں تم دونوں بہن بھائی کو اپنی بہن اور بھائی سمجھتی ہوں"

منیر نے خفگی میں کہا۔

"حد کر دی آپ لوگوں نے بہن ہماری یہاں ہو کے چلی گئی اور آپ نے نہ پہچانی کس گندے مقصد کے لیے اسے یہاں لا کر اس کی بے عزتی کی آپ نے۔ امی آپ بھی اسے نہ پہچان پائیں"

سکینہ ہاتھ ملنے لگی۔

مجھ بدبخت کو کیا خبر یہی میری بچھڑی ہوئی بچی ہے"

"واہ یہ بھی خوب کہی آپ نے۔ آپ اپنے خون کو نہ پہچان سکیں۔ یہ انیس اور فرخندہ تو مغربی تہذیب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا تھا نا آپ کو کہ اِن دونوں کو کلب ؤغیرہ نہ جانے دیا کریں۔ لیکن آپ کہا کرتی تھیں۔ کیا ہوتا ہے۔ اس سے فرخندہ نے کلب جانے کا صلہ جو اِس خاندان کو دیا ہے اس کی بدولت تو ہم سَر اُٹھا کر چلنے کے قابل نہیں رہے ب انیس کی باری ہے۔ دیکھیں مغربی تہذیب اِس سے کیا گل کھلاتی ہے"

سکینہ، انیس اور فرخندہ تینوں نے سَر جُھکا لیے۔

منیر اور طیش میں آگیا۔

"آپ تینوں مجھے طعنہ دیا کرتے تھے کہ میں مشرقی ہوں اب موقع آیا ہے امتحان کا ُن اپنی مغرب زدہ ماں۔ بھائی اور بہن سے پوچھتا ہوں کہ میں مشرقی ہو کر اچھا رہا یا تم مغرب دہ"

منیر زیادہ ہی بھڑک اُٹھا۔

تم مغرب زدوں نے ایک بہن کی شادی سگے بھائی سے کرنا چاہی اور تم لوگوں کے ندے خون نے تمہیں اس ذلیل حرکت سے باز بھی نہ رکھا۔

تمہاری تہذیب نے ایک بیٹی کی بے عزتی ماں کے ہاتھوں کرائی۔ یقیناً تم لوگوں نے اس ے یہ نہ پوچھا ہوگا کہ کس کی بیٹی ہو۔ ماں حقیقی ہے یا سوتیلی۔ بھائی کتنے ہیں۔ بہنیں کتنی ہیں ں ایک ہی سوال تم نے پوچھا ہوگا۔ تمہارے باپ کیا کاروبار کرتے ہیں تاکہ ہم لوگ یہ اندازہ ا سکو کہ لڑکی جہیز میں کیا لائے گی۔ لڑکی والوں کا یہ فرض تو نہیں کہ لڑکے کو پورا گھر سجا اور سامان سے بھر کر آباد کر کے دیں۔ جس نے لڑکی دے دی سب کچھ ہی دے ڈالا۔

اس سے آگے لڑکے کا فرض ہے کہ محنت کرکے اپنا گھر بسائے اور بیوی کو خوش رکھے۔ جہیز جہیز خدا جانے کب یہ لعنت ہمارے ملک سے دُور ہو گی۔

منیر نے دانت پیس کر کہا۔

امی! آج آپ کان کھول کر سن لیں۔ جس لڑکی سے آپ نے میری منگنی کی ہے۔ میں ہرگز اس سے شادی نہ کروں گا۔ مجھے نفرت ہے اس مغرب زدہ سے۔ اگر آپ اسے بہو بنانا چاہتی ہیں تو انیس کے لیے مانگ لیں۔ ان مغربی صاحب کے لیے ٹھیک رہے گی وہ۔ میری طرف سے پکا انکار ہے آپ اِسے جہیز کی خاطر لا رہی ہیں اس کی سیرت اور کردار سے آپ کو کوئی غرض نہیں۔ لیکن میں یہ باتیں پسند نہیں کرتا۔ مجھے جہیز کی لمبی لمبی فہرستیں نہیں۔ ایک بیوی کا مشرقی اور روائتی خلوص چاہیے۔ چاہے وہ غریب ہی ہو۔

تینوں میں سے کسی نے بھی منیر کی باتوں کا جواب نہ دیا۔ جتنی دیر تک وہ انھیں سیدھیاں سناتا رہا سب سر جھکا کر خاموشی سے سُنتے رہے جب وہ چپ ہوا تو سکینہ نے بجھی بجھی آواز میں کہا۔

بس کرو بیٹا! اَب جاکر اسے گھر تو لانا چاہیئے نا "

منیر نے خفگی میں کہا۔

آپ یہ لاکٹ لے جائیں اور جائیں اگر آتی ہے آپ کے ساتھ تو لے آئیں میں علیحدہ ہی اسے مِل لوں گا۔ آپ لوگوں کے ساتھ جاکر وہاں میرا سَر بھی جھکا رہے گا۔ آپ جائیں تینوں ہو آئیں۔ سینٹلائٹ ٹاؤن کے بی بلاک میں رہتی ہے وہ۔

فرخندہ نے دھیرے سے پُوچھا۔

پہلے تو وہ کریم آباد رہتی تھی "

مجھے کچھ خبر نہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کے شوہر کا گھر ہو۔

" نام کیا ہے اس کے شوہر کا؟ "

" تنویر "

فرخندہ چپ ہوئی تو سکینہ نے کہا۔

اب اٹھو بھی نا بیٹا۔ لے آئیں اسے "

مُنیر اپنی ضد پر قائم رہا۔

" میں آپ لوگوں کے ساتھ نہ جاؤں گا امی! "

انیس اور فرخندہ نے اس کے بازو پکڑ کر ایک ساتھ اوپر اُٹھایا۔

" اَب اٹھیے بھی نا بھائی جان۔ پچھلی باتوں پر ملامت بعد میں کر لیجیے۔ پہلے وہ کام تو کریں ی کرنے والا ہے "

منیر کو آخر انھوں نے زبردستی اُٹھا ہی لیا۔

چاروں کنول کے ہاں داخل ہوئے سامنے کریمن بُوا بیٹھی چاول صاف کر رہی تھی۔ سکینہ نے سے بڑے نرم لہجہ میں پُوچھا۔

" کنول ہے گھر؟ "

کریمن بُوا نے چاول چھوڑ دیے۔

آپ لوگ بیٹھیں وہ کوٹھی کے اِس طرف گھاس پر بیٹھی ہیں۔ میں بُلا لاتی ہوں انھیں یہ ہ نے ان سَب کو ڈرائنگ میں بٹھایا اور خود کنول کو بُلانے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد کنول پروین کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی۔ سکینہ، فرخندہ اور انیس کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ خفگی میں اس نے سکینہ سے پوچھا۔

"مجھ سے کوئی کام ہے آپ کو"

سکینہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"ہاں بیٹی۔ آؤ بیٹھو"

کنول اور پروین دونوں اس کے ساتھ والے صوفہ پر بیٹھ گئیں۔

سکینہ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لاکٹ کنول کے سامنے کیا۔

یہ لاکٹ تمہارا ہے بیٹی؟"

کنول نے جھپٹ کر اس سے لے لیا۔

"یہ تو میرا ہے۔ کہاں سے ملا آپ لوگوں کو"

تم جب آج میٹر کو پیسے دینے لگی تھیں تو تمہارے پرس سے یہ گر گیا تھا"

"ہاں یوں ہی ہوا۔ میرے خیال میں بہت پریشان تھی میں اس کے لیے"

یہ تم نے کہاں سے لیا بیٹی"

کنول پھر پہلے رویہ پر اتر آئی۔

"چوری ذمے لگانے کا ارادہ ہے کیا؟"

"نہیں ایسی بات نہیں"

"بس میرا اپنا ہے پھر"

"تم نے کسی سے لیا تو ہوگا ہی نا"

"یہ میرے ماں باپ کی نشانی ہے۔ بچپن میں ان سے بچھڑ گئی تھی ابھی تک نہیں"

سکینہ نے دوسرا لاکٹ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔

اسے بھی دیکھو بیٹی! دونوں میں کوئی یکسانیت ہے۔

کنول فوٹو ملانے لگی۔

ہاں دونوں میں عورت وہی ہے۔ ایک میں تو میں ہوں دوسرے میں خبر نہیں کون ہے"

سکینہ خوش ہو گئی۔

دوسری اس فرخندہ کی ہے۔ اور یہ تمہاری سگی اور بڑی بہن ہے۔ میں تمہاری امی اور انیس دونوں تمہارے بڑے بھائی ہیں تم میری سب سے چھوٹی بیٹی ہو۔ میں آج ت خوش ہوں کہ مجھے میری کھوئی ہوئی بچی مل گئی ہے"

کنول کی پیشانی پر غصے کی شکنیں اور گہری ہو گئیں۔

مجھے آپ لوگوں سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ میں سوچ بھی نہ سکتی تھی میرے ماں باپ اور بہن آپ لوگ ہوں گے۔ مجھے آپ سے کوئی لگاؤ نہیں افسوس میرا دل آپ کے کوئی رشتہ ہونے کو قبول نہیں کرتا۔

سکینہ کی دل شکنی ہو گئی۔

یہ سچ ہے بیٹی کہ میں ہی بدبخت تمہاری ماں ہوں اور یہ تمہارے بھائی بہن ہیں"

میں مانتی ہوں یہ رشتہ ہو گا۔ لیکن میں آپ لوگوں کو ایسے رشتوں میں قبول کرنے کار کرتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری پرورش آپ کے زیر سایہ نہیں ہوئی۔ ورنہ

میں بھی فرخندہ کی طرح نہ جانے کیا کیا گل کھلاتی شکر ہے اس مالک کا جس نے میری پرور
مشرقی ماحول میں کرائی۔ آپ جیسے مغربی مغرور اور امارت پسندوں سے دور ہی رکھتا۔ میں
غریب ماں باپ کی بیٹی ہوں اور وہ مر چکے ہیں۔ میں اپنی اس غریب ماں کی بے حد مشکور ہوں
نے تندرست اور سلجھے ہوئے ماحول میں پرورش کی اور اپنا پیٹ کاٹ کر مجھے ایم بی بی ایس
خدا نے مجھ پر ایک اور احسان کیا۔ اور شوہر بھی اپنی پسند کا دے دیا۔

تنویر کی یاد آتے ہی کنول کی موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

میرا اب اس دنیا میں کوئی نہیں۔ ایک یہ بہن ہے اس نے پروین کی طرف اشارہ
اور ایک میرے شوہر ہیں جنہیں پتہ نہیں کن ناکردہ گناہوں کی سزا ملی ہے اور میرا کوئی
رشتہ دار نہیں۔

سکینہ کی ساری انا ممتا کے پیار میں ڈوب گئی اور منت کرنے کے انداز میں اس
نے کنول سے کہا۔

ہم تو تمہیں لینے آئے تھے بیٹی۔

کنول نے غصے میں کہا۔

" میں کہہ تو چکی ہوں میرا آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں آپ کے ساتھ جانے کا
تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

فرخندہ اٹھ کر کنول کے پاؤں پڑ گئی

معاف کر دو کنول! میری اچھی بہن بھول جاؤ میری خطا کو۔"

انیس نے بھی کنول کے پاؤں پکڑ لیے۔

معاف کر دو میری بہن۔ مجھ سے بڑھ کے کون گنہگار ہو گا۔ جو برسوں کی بچھڑی ہوئی
ی بہن کو نہ پہچان سکا۔"

دونوں اپنے آنسوؤں سے کنول کے پاؤں بھگونے لگے۔

کنول بیچاری بھی رو رہی تھی۔ جلدی جلدی اس نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے۔

منیر دوسری طرف منہ کر کے ہچکیاں لینے لگا تھا۔

سکینہ نے بھی اپنے آنسو پونچھے۔

کنول کھڑی ہو گئی۔

میری کسی کے ساتھ کوئی ناراضگی نہیں میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتی۔ بہن اور
ی کو ایک بہن اور ماں کو میں بیٹی کا پیار نہیں دے سکتی۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ میرا
.... آپ لوگوں کے لیے ہر جذبے سے خالی ہے۔ آپ یہی سمجھیں کہ آپ کی دوسری
ر گئی ہے۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں تقدیر آپ سے انتقام لے رہی ہے۔ حالات
ر آپ لوگوں کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ جیسا سلوک آپ لوگوں نے مجھے ایک
ب کی بچی سمجھ کر کیا تھا ایسا ہی اگر آپ کی بچی پہ کوئی کرے تو کس قدر دکھ اور صدمہ
ہے۔"

کنول نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لاکٹ بھی اُن کی طرف پھینک دیا۔

" اسے بھی لے جایئے میری نگاہوں میں اب اس کی کوئی وقعت نہیں۔ پروین کا
تھ پکڑ کر وہ باہر نکل گئی۔ منیر تیزی سے اٹھا اور اس کے پیچھے باہر آیا۔

کنول "

کنول رُک گئی۔

"کہیئے!"

"ان تینوں کے متعلق تو تمہارا فیصلہ میں سن چکا۔ میرے متعلق بھی کچھ کہتی جاؤ مجھے کسی کے گناہوں کے جرم میں ایک بھائی کی سعادت سے کیوں محروم کر رہی ہو۔"

کنول نے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

سب ایک ہی خاندان کے فرد ہیں۔ آپ بھی ان جیسے ہی مغربی ہوں گے۔

منیر نے گردن جھکالی۔

کردار اور چلن تو اپنا اپنا جدا ہوتا ہے۔ مجھے مغرب سے نفرت ہے۔

یہ تو حالات بتائیں گے مجھے کچھ وقت دیجیئے۔ اس کے بعد میں آپ کے متعلق فیصلہ دے سکوں گی۔"

کنول چلی گئی۔

منیر ڈرائنگ روم میں آیا۔ سب نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ جواب میں اُس نے گردن جھکالی۔ اور دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ سکینہ، انیس اور فرخندہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے اور یوں سب نامراد سے ہو کر گردنیں جھکائے بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ کوٹھی سے باہر نکل گئے۔ بالکل اس مسافر کی طرح جسے منزل کے قریب لوٹ کر اندھیروں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہو۔

کریمن بُوا چائے کے برتن سمیٹنے لگی۔ کنول اور پروین شاید تنویر سے ملاقات کو جانے کے لیے باہر نکلنے ہی لگی تھیں کہ ایک ٹیکسی صحن میں آکر رُکی۔ کنول پروین اور کریمن بُوا جلدی جلدی باہر آگئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے قیصر اس میں سے اُترا۔ کافی دُبلا ہو گیا تھا بچارہ۔ کریمن بُوا دیکھتے ہی چلائی۔

"قیصر!"

پھر اس کی طرف بڑھی۔

قیصر بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔"

"بُوا! وہ رو پڑا۔

ٹیکسی والے نے سامان اُتار دیا اور چلا گیا۔"

کریمن بُوا قیصر کو لپٹائے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ کنول اور پروین نے سامان اٹھا کر اندر رکھ لیا۔

قیصر روتا رہا کریمن نے بڑی مشکل سے اُسے چُپ کرایا۔ کریمن بُوا بار بار کچھ کہنے کو ہمت باندھتی لیکن نہ کہہ سکتی۔ قیصر بچارہ خود ہی آنسو پونچھ کے سنبھلا۔

برجیس واقعی مرگئی بُوا!"

کریمن کا رنگ پہلے سے بھی زرد ہوگیا۔

"ہاں بیٹا! وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئی۔ بڑی پیاری بچی تھی خبر نہیں کن گناہوں کی سزا میں اِسی عمر میں اٹھالی گئی۔"

قیصر کی زبان پھر ہکلانے لگی۔

اسے میری ہی غلطیوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا بُوا! مَیں اسے توقیر کے متعلق اسی وقت یہ سب کچھ بتا دیتا تو شاید یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ بتایا تو مَیں نے صرف اس لیے نہ تھا۔ کہ توقیر کی امی اس کا غلط تعارف کراچکی تھی مَیں نے سوچا دونوں میاں بیوی جب ایک دوسرے سے بے تکلف ہوں گے تو خود بخود ہی ہر انکشاف اُن کے سامنے آجائے گا۔ مجھے کیا خبر تھی توقیر کو ایک دوسرے روپ میں دیکھ کر وہ اِس سے نفرت کرنے لگے گی۔"

کریمن نے اپنی آنکھیں خشک کیں۔

"بڑی حساس بچی تھی۔"

توقیر نے پوچھا۔ تنویر کی آنکھیں اب ٹھیک ہیں نا بُوا۔"

کریمن نے حیرت کا اظہار کیا۔

تمہیں کیسے پتہ چلا۔"

برجیس نے مجھے خط میں سب کچھ لکھ دیا تھا۔ بڑا ظلم ہوا ہے۔ بچارے کے ساتھ اپنی حقیقی ماں سے ملاقات بھی اس وقت ہوئی جب وہ مر رہی تھی۔

کریمن نے دکھ سے کہا۔

آنکھیں تو اس کی ٹھیک ہوگئیں۔ بڑا عاجز ملنسار اور محنتی لڑکا ہے۔

قیصر نے بڑے شوق سے پُوچھا۔

کہاں ہے اس وقت۔ کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔"

کریمن بچاری کیا جواب دیتی چپکی ہورہی۔

بتایا نہیں بُوا! میرا جی بہت اُداس ہے اس سے۔"

کریمن رو پڑی

قیصر پریشان ہوگیا۔

یہ کیا ہُوا۔ مَیں نے توقیر کا پُوچھا ہے اور تم رو دیں۔ بتاؤ تو سہی نا وہ کہاں ہے؟

دھیرے سے کریمن نے کہا "جیل"

قیصر اپنی جگہ سے اُچھل پڑا۔

"جیل! کیا کہہ رہی ہو بُوا"

"یہ سچ ہے بیٹا! پروین کا سُنا ہے تم نے۔"

"ہاں ہاں"

اس کو لینے گیا تھا۔ وہاں چار آدمیوں کو قتل تو کسی اور نے کر دیا۔ لیکن الزام بچارے

تنویر پر آگیا۔

قیصر نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

" اف میرے خدا۔ ہمارے حالات بھی کیا سے کیا ہو گئے۔

" بہت دکھ جھیلے ہیں تنویر نے بٹیا! بڑا اجھارڑ کا ہے"

" یہ دو لڑکیاں کون ہیں بوا "

" چھوٹی کنول ہے اور بڑی پروین۔ تنویر اور کنول کی شادی بھی ہو چکی ہے تم جب آئے اس وقت وہ ملاقات کے لیے تنویر کی طرف ہی جانے لگی تھیں "

" کنول اِدھر کیوں نہیں آئی "

" بس شرماتی یہاں نہ آئی ہو گی۔ اُدھر اپنے کمرے میں بیٹھ گئی ہو گی۔ بڑی سُلجھی اور اچھی بچی ہے "

" مجھ سے شرم کیسی بوا! میری بہن ہے وہ۔ میں تو سوچ رہا تھا برجبیں مر گئی۔ لیکن خدا نے اِسی جیسی مجھے ایک بہن اور دے دی۔ میں تو اب اسے کنول کے بجائے برجبیں ہی کہا کروں گا۔ اُٹھو بوا ہم خود ان کی طرف جاتے ہیں۔

دونوں اُٹھے اور دوسرے کمرے میں آ گئے۔ کنول اور پروین نے قیصر کو دیکھتے ہی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر سلام کیا۔ قیصر کنول کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

" اگر میں غلطی پر نہیں تو آپ کنول ہیں "

مدھم آواز میں کنول بولی۔

" جی! "

اور یہ پروین " قیصر نے پروین کی طرف اشارہ کیا۔

پروین نے سر جھکا لیا۔

" جی ہاں "

کریمن بوا باہر جانے لگی۔

میں چائے لاتی ہوں بنا کے "

قیصر نے اسے منع کر دیا۔

رہنے دو بوا۔ ہم تنویر کی طرف جا رہے ہیں۔ بس کنول سے ذرا ایک بات کروں "

کریمن وہیں رُک گئی قیصر نے کنول کو مخاطب کیا۔

"کنول! برجبیں کی موت کے بعد یہ محسوس کر رہا ہوں کہ خدا نے تمہارے روپ میں مجھے برجبیں جیسی ہی ایک اور بہن دے دی ہے۔ اب تمہیں اگر کوئی احتراز نہ ہو تو آئندہ میں تمہیں کنول کے بجائے برجبیں کہہ کر پکاروں۔ اس طرح میں یہ محسوس کرتا رہوں گا کہ میری بہن زندہ ہے اور تنویر کے ساتھ میرا وہی پرانا رشتہ ہی ہے۔ مجھے اُمید ہے میری بہن مجھے مایوس ——— قیصر کی پلکیں بھیگ گئیں اور ضبط کرنے کی خاطر اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

کنول بھی غمگین ہو گئی۔

" مجھے بے حد خوشی ہو گی کہ میں آپ جیسے بھائی کی بہن ہوں "

قیصر خوشی میں مسکرا ہی تو دیا۔

" بس اب مجھے کچھ نہیں چاہیئے میری بہن مجھے مل گئی ہے چلو اب تنویر کے پاس

چلیں۔"

پروین بھی چپ چاپ اُن کے ساتھ باہر آگئی۔

بازار میں کامران کے کلینک کے سامنے سے گزرتے ہوئے قیصر نے کار روک دی اور کنول کی طرف دیکھتے ہوئے وہ نیچے اُترا۔

"میں ابھی آیا پرجبیں!"

کلینک میں جب وہ داخل ہوا تو کامران کرسی سے اُٹھا اور بھاگ کر اس سے لپٹ گیا۔

"ارے کب آئے تم قیصر! اطلاع تک ہی نہ دی۔ بڑے بے مروت ہو میاں"

قیصر نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"آج اور ابھی ہی آیا ہوں"

خیریت سے لوٹے ہو نا"

قیصر غمگین ہوگیا۔

"خیریت ہوتی تو آتا ہی کیوں۔ میرے گھریلو حالات اس قدر ابتر ہو گئے اور آپ نے پوچھا تک ہی نہیں"

"کیا ہوا" کامران نے پریشانی سے پوچھا۔

"میرے بعد توقیر کی کچھ خبر لی آپ نے"

"اس کے متعلق بھی تمہیں بتاتا ہوں پہلے اپنے گھریلو حالات تو کہو"

"اسی سے تو میرے گھریلو حالات وابستہ ہیں"

"وہ کیسے؟"

"میں نے فارن جانے سے قبل اپنی بہن پرجبیں کی شادی اس سے کر دی تھی"——

کامران نے اس کی بات کاٹی۔

"ہمیں تو خبر ہی نہیں کی"

"آپ ان دنوں اپنے ماموں کے ہاں ملتان گئے ہوئے تھے ویسے بھی میری روانگی سے دو دن قبل بڑی سادگی سے نکاح ہوا تھا۔ کسی کو بھی دعوت نہ دی تھی۔

تمہارے بعد میں تو توقیر کے ہاں جاتا رہا۔ ایک بار تو اس وقت گیا جب وہ گریجویشن کرنے کے بعد کہیں سروس کر رہا تھا۔ میں نے اس کی امی سے اس کا پوچھا لیکن وہ گھر پر نہ ملا تھا بعد میں دو ایک بار پھر گیا۔ لیکن اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آخری بار جب اس کے ہاں گیا تو پتہ چلا کہ وہ اندھا ہو گیا ہے اور گھر چھوڑ کر کہیں جا چکا تھا اس کے بعد مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ حالانکہ میں نے اسے بڑا تلاش کیا۔ دراصل اس گھر کے ساتھ توقیر کا کوئی حقیقی رشتہ نہ تھا۔ انہوں نے صرف اس کی پرورش ہی کی تھی۔ ورنہ اس کے ماں باپ کوئی اور تھے جن سے بچپن میں وہ بچھڑ گیا تھا۔

قیصر نے اپنی نم آلود آنکھیں جھکا لیں۔

آنکھیں تو اس بچارے کی ٹھیک ہو گئی تھیں۔ لیکن بُرے وقت اور سنگ دل زمانے نے اسے جیل پہنچا دیا۔"

کامران بوکھلا گیا۔

"جیل چلا گیا وہ" کیا کہہ رہے ہو تم"

"سچ کہہ رہا ہوں میں"

" آخر کس جُرم میں؟"

" مَیں ابھی اسی کے پاس جا رہا ہوں میرے ساتھ آؤ۔ راستے میں سب کچھ بتاؤں گا"

دونوں تیزی سے باہر نِکل گئے۔

مختلف سڑکوں پر ہوتے ہوئے چاروں جیل پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر ہی انتظار کرنا پڑا ہوگا کہ تنویر باہر آیا۔ قیصر نے اس سے لپٹ جانا چاہا۔ لیکن لوہے کی سلاخیں بیچ میں حائل تھیں اور صرف ہاتھ ملانے پر ہی اکتفا ہوا۔ قیصر نے گہری آواز میں کہا۔

" اتنا بڑا قدم اٹھانے سے قبل تم نے میرے واپس آنے کا تو انتظار کر لیا ہوتا میَں خود آکر پُرامن طریقے سے سب کچھ ٹھیک کر لیتا۔"

تنویر نے سَر جُھکا لیا۔

" بس جو ہونا تھا ہوگیا۔"

کامران بھی بولا۔

" تمہاری جب آنکھیں جاتی رہی تھیں تنویر! تم میرے پاس کیوں نہ آئے۔ تُم نے ایک موقع پر مجھے بھائی کہا تھا۔ اور بھائی بھائیوں سے ایسا ہی .... سلوک کرتے ہیں۔ میں نے تمہاری تلاش میں شہر کی گلی گلی چھان ماری لیکن کہیں بھی تو تمہارا پتہ نہ ملا تھا"

تنویر نے اپنی صفائی پیش کی۔

" اس وقت تو مجھے اپنے آپ کا ہوش نہ تھا بھائی جان۔ بس ایک ہی آرزو تھی کہ اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤں شاید میرے حالات آپ نے سن ہی لیے ہوں؟"

" ہاں ابھی ابھی راستے میں قیصر نے مجھے تفصیل سے کچھ بتایا ہے۔"

قیصر پھر بولا۔

" وکیل کونسا کیا ہوا ہے تنویر!"

" منیر نام ہے اس کا۔"

" عدالت نے اب تاریخ کون سی دے رکھی ہے؟"

" پرسوں کی تاریخ ہے۔ جرح ہوگی"

" مَیں پھر آج ہی وکیل سے مل کر پورے کیس کا جائزہ لیتا ہوں میرے خیال میں منیر انیس کا بڑا بھائی ہی ہوگا۔"

کامران جھٹ سے بولا۔

" بالکل وہی ہوگا۔ اور تو اس نام کا کوئی وکیل ہی نہیں۔ آج ہی دونوں اِس سے ملتے ہیں"

تنویر نے ہلکے سے کہا۔

" وہی ہے اور وہ کنول کا حقیقی بھائی ہے۔"

قیصر اور کامران دونوں نے تعجب سے پُوچھا۔

" کنول کا بھائی۔ وہ کیسے؟"

" یہ سب کچھ کنول ہی آپ کو بتا دے گی"

کامران نے قیصر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچا۔

آؤ ذرا اس دیوار کی اوٹ میں کھڑے ہوتے ہیں۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے دونوں

میاں بیوی کو ذرا کھل کر بات کرنے کا کوئی موقع تو دو۔

قیصر فوراً بول پڑا۔

”پرجبیں! ہم ابھی آتے ہیں۔ ابھی وقت ہے اتنی دیر تک تم باتیں کرو“

دونوں قریب ہی ایک دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔

تنویر نے بڑے دکھ سے نام دوہرایا۔

پرجبیں!

کنول آگے بڑھی۔

”وہ مجھے پرجبیں ہی کہہ کر پکارتے ہیں۔ کہہ رہے تھے اِس طرح مجھے یہ احساس نہیں ہوگا کہ میری بہن مر گئی ہے۔ اور تنویر کے سامنے میرا کوئی رشتہ نہیں“

تنویر خلاؤں میں گھورنے لگا۔

”وہ بہت بلند انسان ہے“

پروین پہلی بار بولی۔

تنویر! اس کنول کو سمجھاؤ کچھ ساری رات روتی رہتی ہے۔ لاکھ تسلّی دے کر چپ کراتی ہوں۔ لیکن بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیتی ہے“

تنویر نے کنول کی طرف غور سے دیکھا۔

”کیوں کنول! ٹھیک ہے یہ“

کنول بیچاری بُری طرح رونے لگی۔

”بس میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ اپنے پاس بُلا لیجیے مجھے بھی“ کنول ہچکیاں

لگی ”مجھے ——— میں ——— مجھ میں اب برداشت کی ہمت نہیں رہی آپ کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتی“

تنویر نے اس کے گال پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”بس اس قدر جلدی ہمت ہار بیٹھیں تم تو بچپن سے دکھ اور غم برداشت کرتی آئی ہو زندگی کے اس موڑ پر آکر کیوں دل چھوڑ رہی ہو فکر نہ کرو۔ یہ کیفیت بھی اب چند دنوں ہے۔ چھوٹ گیا ہر غم دُھل جائے گا۔

”اور اگر ———“ کنول نے اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا اور زیادہ سسک دی۔

”بس میں آپ کے بغیر نہیں جی سکتی۔ بچھڑنا ہی ہے آپ نے تو“

تو ——— اپنے ہاتھوں سے ابھی میرا گلا گھونٹ دیجیے“

کنول نے تنویر کے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیے اور پھکو پھکو رو دی۔

تنویر اور پروین بھی رونے لگے۔ دیوار کی اوٹ میں قیصر اور کامران تک بھی اُن واز پہنچ رہی تھی۔ قیصر بھی رو دیا۔ اور کامران نے مُنہ دوسری طرف پھیر کر اپنے آنسو لیے۔

اچانک ایک آواز گونجی

”ملاقات کا وقت ختم ہوگیا“

تنویر واپس چلا گیا۔ کنول اور پروین اپنے آنسو پونچھتی ہوئیں پیچھے ہٹ گئیں۔

آج کنول، پروین اور قیصر جب تنویر کو دیکھنے جیل پہنچے تو غیاث، مسعود اور منیر وہاں کھڑے تھے غیاث روہانسی آواز میں کہہ رہا تھا۔

تم نے ہمیں اپنے حالات کی خبر تک نہ کی بیٹا! آخر ہمارا بھی تمہارے ساتھ کوئی رشتہ ہے"

تنویر نے سر جھکا لیا۔

بس غلطی ہو گئی ماموں"

" تمہارے بعد مسعود کی شادی میں نے اپنی بیٹی سے کر دی ہے۔ اس دن بھی تمہاری کمی بے حد محسوس کی۔ ہم بے شک غریب ہی سہی بیٹا! لیکن تمہاری خاطر تو ہم دونوں جان تک

بازی لگا دیتے۔ تمہاری آنکھیں جاتی رہیں تم نے کوئی پتہ نہ دیا۔ تم پر قتل کا الزام لگا یا یل آ گئے پھر بھی ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ خدا گواہ ہے تمہارے بغیر مچھلی مارکیٹ اُداس گئی ہے اور دریا کا گھاٹ ہمیں سونا سونا محسوس ہوتا ہے۔ کاش تم نے ہمیں اپنے حالات باخبر رکھا ہوتا۔ وہ تو کل مسعود کو قیصر بانو بازار ملے اور تمہارا پتہ چلا"

تنویر سر جھکائے خاموش رہا۔

غیاث نے منیر کو مخاطب کیا۔

" آپ تنویر کے وکیل ہیں"

منیر جو مایوسی کے عالم میں ٹکٹکی تنویر کو دیکھے جا رہا تھا غیاث کی طرف مخاطب ہوا۔

"جی ہاں"

غیاث نے اپنی میلی اور پھٹی سی قمیص سے نوٹوں کی ایک گٹھی نکالی۔

" یہ لیجیے پانچ سو روپے میرے پاس ابھی یہی ہیں۔ میں تھوڑے تھوڑے اور بھی کو دیتا رہوں گا۔ آپ خدا کے لیے کسی طرح تنویر کو بچا لیجیے۔ میرے لیے یہ اس مسعود کسی طرح کم نہیں۔ اسے اگر کچھ ہو گیا تو ——— تو میں ——— غیاث کے آنسو بہہ ۔ اور وہ بچوں کی طرح سسک پڑا۔ مسعود بھی رو دیا۔ کنول، پروین اور قیصر جو ذرا پرے ہٹ کر ہی کھڑے ہو گئے تھے آبدیدہ ہو گئے۔

منیر بڑا متاثر ہوا۔ نوٹ اس نے غیاث کی جیب میں ڈال دیے اور بمشکل ڈبڈبتی ز میں کہا۔

میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ غریب انسان واقعی جلدی پگھل جاتا ہے۔

کاش تمہاری جگہ میں ہوتا۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہو۔
میرا اور تنویر کا تعلق صرف ایک وکیل اور مجرم کا سا ہی نہیں یہ میری بہن کا سہاگ بھی ہے
میں اس کی خاطر اپنی جان بھی دے دوں گا۔ میں نے اگر دیکھا کہ مقدمہ خراب ہوتا جا رہا ہے
تو وکالت چھوڑ دوں گا۔ اور تنویر کا جرم اپنے سر لے لوں گا۔

منیر ہکلانے لگا۔

میں ـــــــ میں اپنی بہن کی مانگ اُجڑنے نہ دوں گا۔ میں اس پر ثابت کر دوں
گا کہ میں اسی کے ماں باپ کا صاف خون ہوں گندہ نہیں۔ حالات نے مجھے الجھا دیا ہے!
بہن کو میں بہن کہہ کر پکارنے کو ترس گیا ہوں۔ میں اسے احساس دلانا چاہتا ہوں کہ
اِس بھرے جہان میں وہ اکیلی نہیں۔ میں اس کا بھائی ہوں اس کے سہاگ کی سلامتی
کے لیے میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گا۔"

تنویر دھیرے سے بولا۔

میں اپنا الزام تمہیں اپنے سر تھوپ لینے کی اجازت نہیں دوں گا۔ تقدیر مجھ سے
جو مذاق کر رہی ہے وہ مجھے خود ہی برداشت کرنا ہو گا۔"

منیر کی آواز گھگیا گئی۔

"تم مجھے بہن کی نظروں میں رُسوا کرنا چاہتے ہو۔ اور میں چاہتا ہوں بہن کے
سامنے میں جب اپنے آپ کو بھائی کہلوانے کو جاؤں تو سُرخ رو ہو کے جاؤں۔
بہن کی خاطر تمہیں ہر حالت میں لوہے کی ان سلاخوں سے باہر دیکھنا چاہتا ہوں

تنویر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کنول بھاگتی ہوئی آگے بڑھی اور منیر سے لپٹ گئی

بھیّا! آپ بہت اچھے ہیں مجھے فخر ہے میں آپ کی بہن ہوں۔"
منیر اسے اپنے ساتھ لپٹائے رو پڑا۔
قیصر اور پروین بھی پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

اچانک سب کی نگاہیں جیل کے بیرونی گیٹ کی طرف اُٹھ گئیں ساجدہ اندر داخل
ہو رہی تھی۔ پریشانی میں اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اور ننگے پاؤں وہ بڑی تیزی سے
آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے شہناز بھی تھی۔ جب وہ قریب آئیں تو تنویر نے گردن جھکا لی
دونوں ماں بیٹی نے کچھ دیر خاموشی سے اُسے دیکھا۔ پھر ساجدہ کی غمگین سی آواز سنائی دی
"ہم دونوں ماں بیٹی کو پہچانا تم نے؟"
تنویر چپکا رہا اور گردن جھکائے رکھی۔

ساجدہ کی ڈوبتی ہوئی آواز پھر اُبھری۔
کیا ہم سے اب بولنا بھی پسند نہیں کرتے۔" ساجدہ اور شہناز دونوں اپنے آنسو
صاف کرنے لگیں۔
تنویر نے گردن اوپر اُٹھائی۔

"اُف"

اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے تیر رہے تھے۔ ضبط کرتے
ہوئے اس نے کہا۔

میں اپنی اِس ماں کو پہچاننے سے کیسے انکار کر سکتا ہوں جس نے میری پرورش کی
مزدوری کر کے میری پڑھائی کے اخراجات برداشت کیے۔ اس بہن کو کیسے بھول سکتا

ہوں جس نے مجھے ہمیشہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا۔"

شہناز رو پڑی۔

"آپ نے پھر چوری چوری گھر کیوں چھوڑا بھائی جان؟"

تنویر نے اپنا سر لوہے کی سلاخوں پر ٹکا دیا تھا۔

"وقت کا تقاضا وہی تھا جو میں کر گزرا۔"

ساجدہ پھر بولی

"تمہاری آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ تم نے شادی بھی کر لی۔ لیکن ہماری طرف پھر بھی نہ لوٹے۔

تنویر آزردہ ہو گیا

"بس غلطی ہو گئی امی جان!"

"اپنی اس بہن کو دیکھو تمہارے بعد کیا حالت ہو گئی ہے اس کی۔ ہم دونوں تو پاگل ہی ہو گئی تھیں۔ وہ تو کل قیصر نے مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتایا تو تمہاری خیر ہو میرا دل ابھی تک نہیں مانتا کہ تم قتل کے جرم میں جیل آ گئے ہو کاش تمہیں اس حالت میں دیکھنے سے قبل میں اندھی ہو چکی ہوتی۔ کیسے مان لوں کہ میرا بیٹا کسی کو قتل کر کے جیل بھی جا سکتا ہے۔

تنویر نے اپنی آستین سے آنکھیں صاف کیں۔

"میں بے قصور ہوں ماں! بالکل بے قصور، تقدیر مجھے پتہ نہیں کن گناہوں کی سزا میں یہاں لے آئی ہے۔"

کنول پر یہ الفاظ گویا تیز کا کام کر گئے۔ سسک سسک کر رونے لگی بچاری کنول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ساجدہ نے تنویر سے پوچھا۔

"یہ تمہاری بیوی ہے۔"

تنویر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ساجدہ نے کنول کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تم دونوں نے علیحدگی میں ابھی کوئی بات بھی نہ کی ہوگی۔ وقت بھی شاید تھوڑا ہی ہو گا ابھی۔ میں اب کل کچہری میں ہی ملنے آؤں گی۔" ساجدہ اور شہناز پیچھے ہٹ کر دائیں رف بوسیدہ سی دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔ دوسرے سب افراد بھی ان کے پاس ے چلے گئے۔ تنویر کے پاس صرف کنول رہ گئی تھی وہ ابھی تک بچاری سسک سسک کر و بہائے جا رہی تھی۔

تنویر نے لوہے کی سلاخوں میں سے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور کنول کے ہاتھ پکڑتے ئے غمگین آواز میں پکارا۔

"کنول!"

کنول نے کوئی جواب نہ دیا۔ تنویر کے ہاتھ اس نے اپنی آنکھوں سے لگا لیے اور ز ل کر روتے ہوئے ہچکیاں لینے لگی۔ تنویر سے اس کی حالت دیکھی نہ گئی دل پھٹا جا رہا بچارے کا۔ کنول کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے وہ بچارگی کے عالم میں پکارا۔

"کنول! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

کنول پھر چُپ رہی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور تنویر کی طرف دیکھنے لگی۔

" ادئی اللہ "

کس قدر غم اور دکھ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں گھل سا گیا تھا۔ تنویر کی طرف وہ ایک ہی ٹک میں دیکھے بھی جا رہی تھی، اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری تھے۔

تنویر اپنے دونوں انگوٹھوں سے اس کے گال صاف کرنے لگا۔

" یہی حالت بنائے رکھوگی۔ تو سوچو مجھ پر کیا گزر جائے گی "

کنول جیسے پھٹ پڑی

" بس میں اب ضبط نہیں کر سکتی۔ تقدیر ہم سے جو انتقام لے رہی ہے وہ میری برداشت سے باہر ہے۔ میں کیسے برداشت کر جاؤں۔ میرا شوہر جیل میں ہے۔ اور میں

———کنول کی آواز اس کی ہچکیوں میں ڈوب کر رہ گئی۔

تنویر کی پلکیں بھیگ گئیں۔

" تم نے یہی حالت بنائے رکھی تو میں جیل کی ان تاریک کوٹھڑیوں میں زندگی کے طویل شب و روز کیسے گزار سکوں گا۔"

" آپ ہی بتائیے نا میں کیا کروں " کنول کے لہجے میں گہری افسردگی تھی۔

" میں کیا بتاؤں ———

" بس ——— "

" بس یہی کہ میرے پاس آ کر رویا نہ کرو۔ ہنستی رہا کرو خواہ تمہیں زبردستی ہی ایسا کرنا پڑے "

" زبردستی کی ہنسی آپ کو اچھی لگے گی؟ "

تنویر کی آواز میں دکھ کا شائبہ تھا

" اِس حالت میں جب کہ حالات نے مجھے لوہے کی سلاخوں کے پیچھے لا کھڑا کیا ہے۔ مجھے ہر خلافِ طبع بات سے اپنے آپ کو مانوس کرنا ہی پڑے گا۔

" لیکن کس جرم کی سزا ہے یہ سب کچھ؟ "

" سزا نہیں ظلم ہے یہ نہ تو وقت کے تیز دھارے سے ہم جواب طلبی کر سکتے ہیں کہ ہمارا دوش کیا ہے اور نہ عدالت کے روبرو ہم اپنے دل کی سچی بات کہہ کر سُرخ رو ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو صرف قانون کی زبان سمجھتی ہے میری زبان پر کون اعتبار کرے گا کہ میں بے گناہ ہوں "

کنول نے گردن جھکا لی

زندگی میں کوئی ایسا قصور تو نہ ہوا تھا۔ جس کی اتنی بڑی سزا مل رہی ہے "

" تنویر نے اپنے دونوں ہاتھ کنول کے شانوں پر رکھ دیے۔

" کاش میں نے ابھی تک شادی ہی نہ کی ہوتی تو میرے ساتھ تمہاری زندگی بھی اس قدر تلخ اور خاردار تو نہ ہوتی۔ اور

اور ——— نہ ہی تمہیں کسی سے یہ فقرہ سُننا پڑتا کہ ——— کہ کنول کا شوہر قاتل ہے "

کنول تڑپ گئی۔

" خدا کے لیے ایسا نہ کہیے۔ شادی اگر نہ ہوئی ہوتی تو بھی مجھے آپ کے دکھ کا اتنا ہی احساس

ہونا جتنا اب ہے ۔ مجھے اس دن سے ہی آپ سے بے پناہ محبت ہو گئی تھی جس دن آپ انّی کو ریلوے لائنوں سے اٹھا کر لائے تھے کوئی اور وقت ہوتا تو میں یہ الفاظ نہ کہتی ۔ لیکن ایک بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے سامنے ایسے جذبات کا اظہار کرنے میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتی ۔"

تنویر کی آنکھوں میں نمی اور گہری ہو گئی ۔

کنول ! تم میری زندگی کا محور ہو ۔ زیست کی راہ گزر کے کسی موڑ پر میں اگر تم سے جُدا ہو کر دھندلکوں میں کھو گیا تو میرا تعاقب نہ کرنا ۔ میری طرف سے تمہیں ابھی اجازت ہے کہ تم اپنے لیے زندگی کی کوئی نئی راہ تلاش کر لینا ۔ شاید زندگی کی یہ طویل مسافت تم تنہا طے نہ کر سکو ۔"

کنول پر گویا کسی نے پتھریلی چٹان اُٹھا کر پھینک دی ہو کچلی گئی بیچاری تڑپ تڑپ اُٹھی ۔

ایسا اگر کوئی وقت آگیا تو میں زندہ رہنا پسند نہ کروں گی ۔ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کے بجائے موت کو زندگی پر ترجیح دوں گی ۔ آپ کے بغیر میرا جینا محال ہو گا ۔ قسمت نے اگر آپ کو وقت سے پہلے ہی مجھ سے جدا کر دیا تو میں ——— میں آپ سے بھی پہلے موت سے بغلگیر ہو جاؤں گی ۔ اور یوں ہو سکتا ہے اس جہان میں بھی میری اور آپ کی روح ہمیشہ کے لیے ایک ہو کر نہ بچھڑیں ۔"

نہیں کنول ! میرے بعد تمہیں زندہ رہنا ہو گا ۔ اس قدر بزدل تو نہ ہو ۔"

"میں بھی عورت ہوں کوئی پتھر کا مجسمہ تو نہیں ۔"

" خبر نہیں اس بے رحم زمانے میں کتنی عورتیں ہوں گی جو اپنے جیون ساتھی کی جدائی میں سسک سسک کر زندگی بسر کر رہی ہوں گی ۔"

کنول رونے لگی اور تنویر کے پاؤں پر گر گئی ۔

" تنویر کے بغیر کنول زندہ نہ رہ سکے گی ۔ میں ——— بس میں ——— آپ کے بعد ———

کنول کی ہچکیاں بلند ہونے لگیں ۔

اسی لمحہ فضا میں آواز بلند ہوئی ۔

" ملاقات کا وقت ختم ہو گیا ۔"

تنویر بوجھل قدموں سے پیچھے ہٹ گیا ۔ کنول بھی بیچاری دیوار کے پیچھے کھڑے دوسرے لوگوں کی طرف چل دی ۔ اس کی چال میں ایسی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے ابھی گری کہ ابھی گری ۔

" اُف !"

خدائے برتر نے بھی اس فانی جہان میں انسان کی کیسی ہست و بود بنا رکھی ہے ۔

وقوعہ کے روز تم پہلی بار اس بازار میں نہیں گئے تھے۔

حالات بتاتے ہیں تم اکثر وہاں جاتے رہتے تھے۔

پروین سے تمہیں محبت تھی۔

وہ تمہاری بہن نہیں۔ تمہاری اور اس کی ملاقات اس بڑھیا کے ہاں اکثر ہوتی رہتی جسے تم نے اپنی ماں ظاہر کیا ہے۔ حالانکہ وہ اس پروین کی ماں تھی تمہارا اس سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ قتل کی واردات کے بعد تم نے ایک دوسری لڑکی سے شادی کر لی اور پروین کو بہن بنا لیا تاکہ تمہارے پاپ پر پردہ پڑا رہے۔ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے تنویر کی طرف دیکھتے ہوئے مخالف پارٹی کے وکیل نے مُنہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے کہا۔ اور پھر وکیل بھی وہ جو کبھی اس کا بھائی رہ چکا تھا۔

۔ وہی وحید

جس نے اُسے آنکھوں کی بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ کیونکہ مستغیث کا وکیل وہی تھا۔

تنویر کٹہرے میں گردن جھکائے کھڑا تھا۔ کنول، پروین، ساجدہ، قیصر، کامران مسعود اور غیاث بھی باہر کھڑے مقدمے کی کارروائی سن رہے تھے وحید کے عین سامنے منیر کھڑا تھا۔

وحید نے ذرا سا رک کے پھر تنویر سے پُوچھا۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے یہ سچ نہیں"

تنویر نے آہستہ آہستہ اپنی گردن اوپر اٹھائی۔

"یہ سراسر الزام ہے وکیل صاحب"

وحید نے اور گرہ لگائی۔

اگر وہ تمہاری بہن تھی اور تم اسے وہاں سے نکالنا چاہتے تھے تو تم نے پولیس کی مدد کیوں نہ کی۔

یہ غلطی نہ کی ہوتی تو آج عدالت کے رُوبرو کھڑے ہو کر آپ کے یہ دل شکن الزامات کیوں برداشت کرنے پڑتے اور قانون کی نظر میں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی قاتل کیوں تصور کیا جاتا"

"کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ جس وقت تم زہرہ بائی کو لینے گئے اُسی وقت یہ حادثہ رونما ہوا

"یہ سچ ہے"

"کیا زہرہ بائی اور مقتولوں کے علاوہ کوئی اور بھی وہاں موجود تھا۔"

"کوئی نہیں تھا۔ لیکن مجھے نہیں پتہ کس نے قتل کیا تھا۔ صرف اِس قدر دیکھ سکا تھا کہ اس کمرے کی سامنے والی کھڑکی میں سے کسی نے فائرنگ کی تھی۔"

وحید نے طنزیہ کہا۔

"تو گویا آسمان سے فرشتے آکر قتل کر گئے۔"

"یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ اصلِ قاتل کون ہے؟"

حالات ثابت کرتے ہیں کہ تم قاتل ہو۔"

ساجدہ کی حالت وحید کی باتیں سن سن کر بُری ہوتی جا رہی تھی شہناز بھی غصے میں ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ لیکن وحید کسی کی پرواہ کیے بغیر خوب جھوٹی تہمتیں باندھ رہا تھا تنویر پر۔ کنول بچاری رو رہی تھی۔

جب جرح ختم ہوئی تو پولیس تنویر کو جیل لے گئی وحید جب عدالت سے باہر آیا تو ساجدہ نے اسے آواز دے کر پیچھے سے پکارا۔

"وحید!"

وہ رک گیا

تم یہاں کدھر آئی ہو امی؟"

ساجدہ غصے میں بپھر گئی۔

"ماتم کرنے آئی ہوں تمہاری وکالت کا!"

یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔"

"میں اپنے بیٹے کے مقدمے کی تاریخ پر آئی تھی عدالت کے رُوبرو تُم نے اِسے

جو جھوٹے الزامات دیے ہیں ایک ماں ہوتے ہوئے برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے اگر خبر ہوتی کہ تم ایسے کپوت ثابت ہوں گے تو پیدا ہوتے ہی تمہارا گلا گھونٹ دیتی۔ کاش تم میرے بیٹے نہ ہوتے۔"

وحید نے صفائی پیش کی۔

یہ میرا فرض ہے امی! میں مخالف پارٹی سے اپنی فیس لے چکا ہوں مجھے اب ہر حالت میں جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنا ہوگا۔ مجھے ہر حربہ استعمال کرنا ہوگا وکالت نام ہی اسی کا ہے امی! تم تو یونہی بس خفا ہوتی جا رہی ہو۔

ساجدہ برس پڑی۔

"اگر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کا نام ہی وکالت ہے تو میں لعنت بھیجتی ہوں تمہارے پیشے پر جو انسان کی عاقبت کو داغدار بنا دیتا ہے۔"

ساجدہ کا جسم کپکپا رہا تھا۔ لڑکھڑاتی ہوئی وہ ایک طرف چلی گئی۔

دو دن بیت گئے۔

تیسرے روز۔ ایک خاصا مجمع تنویر سے ملاقات کو آیا۔ کنول، پروین، قیصر، منیر اور شہناز کے علاوہ آج منزہ، اس کا شوہر انجم اس کے علاوہ انجم کے ابا بھی تھے۔ شہناز تنویر کے پاس آتے ہی رونے لگی۔ منزہ اور انجم تنویر سے احوال پُرسی کر رہے تھے لیکن اس کی توجہ شہناز کی طرف تھی آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے شاذ کیوں رو رہی ہو"

منزہ نے فکرمندی سے کہا۔؟"

آپ سے کسی نے کچھ نہیں کہا؟"

تنویر پریشان ہوگیا۔

"کیا؟"

"خالہ جان پرسوں کی فوت ہوچکی ہے۔"

تنویر چکرا گیا۔

"کیا کہہ رہی ہو نزی!"

"سچ ہے بھائی جان۔ جس روز آپ کے مقدمے کی تاریخ تھی اس روز وہ گھر جا کے گر پڑیں اور پھر حرکتِ قلب بند ہوگئی۔"

تنویر نے پیشانی پر ہاتھ دے مارا۔

"اُف خدایا!"

منزہ پھر بولی۔

"وحید بھائی بھی ہسپتال میں ہیں بھیا!"

"وہ کیوں؟"

زاہد نے پرسوں وحید بھائی سے کچھ روپیہ مانگا تھا۔ بھائی جان نے دینے سے انکار کردیا۔ جس کی بنا پر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔ فریدہ نے بھی زاہد کا ساتھ دیا۔ دونوں بہن بھائی نے انہیں مار مار کر مفلوج کردیا اور گھر کا سارا اثاثہ اور نقدی لے کر فریدہ بھائی کے ساتھ میکے چلی گئی۔ وحید بھائی اب ہسپتال پڑے ہیں کل انہوں نے فریدہ کو طلاق بھی بھیج دی ہے۔ میں ان کے پاس گئی تھی۔ آپ کی طرف سے بہت شرمندہ ہیں وہ۔ معافی مانگنا

ہتے ہیں آپ سے چل نہیں سکتے ورنہ خود آتے۔ ہمیں کہلا بھیجا ہے کہ تنویر سے میری سب اذیتوں کی میری طرف سے معافی مانگنا۔"

تنویر کچھ کہنے والا تھا کہ شہناز آگے بڑھی اور اس کے شانے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے۔

مجھے بتایئے بھائی جان کہاں جاؤں میں۔ امی مرگئیں۔ وحید بھائی ہسپتال چلے گئے اور ب جیل میں۔ کدھر جاؤں بھائی جان کہاں رہوں میں۔ مجھے بھی اپنے پاس نہیں بلا لیجیے ں تو اپنے ہاتھوں ابھی گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے ختم کردیں۔

تنویر نے شہناز کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میں تمہارا بھائی ہوں۔ جیل میں ہوا تو کیا ہوا۔ جب تک زندہ ہوں تمہیں کوئی تکلیف پہنچنے دوں گا۔ آج کے بعد تم ہمیشہ کے لیے کنول اور پروین کے ساتھ رہو گی۔"

کنول نے سر کے اشارے سے منزہ کو کچھ کہا۔ اور پروین کو لے کر پیچھے ہٹی اور دائیں ف دیکھتے ہوئے کہا۔

بھائی جان آپ بھی ذرا ادھر چلے جایئے۔

منیر فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

اب کے قیصر بولا۔

"پروین! تم بھی تھوڑی دیر کے لیے شہناز کے پاس چلی جاؤ۔

پروین بھی دیوار کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

تنویر کے پاس اب کنول، قیصر، انجم اور اس کے آبا رہ گئے۔ کنول اور تنویر کی طرف تے ہوئے بولی۔

ہم سب نے مل کے ایک فیصلہ کیا ہے ۔بشرطیکہ آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو"۔

تنویر نے دونوں ہاتھوں سے لوہے کی سلاخیں تھام لیں۔

"تم نے تو بھی فیصلہ کیا ہے کنول ! اسے آخری سمجھو ۔ میں جانتا ہوں تم جو کچھ کرو گی اُ
میں میری بہتری ہی ہوگی"۔

میں چاہتی ہوں شہناز اور منیر بھائی کی شادی کر دی جائے"۔

تنویر نے کچھ دیر سر جھکا کر سوچا۔

"منیر کا عندیہ لیا تم نے"۔

"ان سے میں بات کر چکی ہوں ۔ وہ تو رضامند ہیں ۔

"اور شہناز"؟

"اس سے بھی پروین باجی نے پوچھا تھا۔ کوئی اعتراض نہیں اسے اب تو صر
آپ کی رضامندی رہ گئی"۔

"میری رضامندی کا کیا ہے تمہارا فیصلہ میرا فیصلہ ہے میری طرف سے تو
آج ہی اس کام سے فارغ ہو جاؤ"۔

"نہیں اتنی جلدی نہیں۔ خدا آپ . . . کو یہاں سے نکالے تو پھر سب کام ہو
گے"۔

"نادان ہو تم ۔قسمت نے اگر مجھے موت کے سامنے کھڑا کیا تب ۔میری رہائی کوئ
یقینی امر تو نہیں۔ تم جتنی جلدی ہو سکے دونوں کی شادی کر ڈالو ۔ مجھے بے حد خوشی ہوگ

کنول خفا ہوگئی ۔ روہانسی آواز میں کہا ۔

"پھر آپ نے ویسی ہی مایوسی کی باتیں کہنا شروع کیں نا"؟

تنویر کچھ اُداس ہوگیا۔

"میں تمہارا شوہر ہوں ۔ اس لیے محبت نے تمہارے دل میں یہ یقین اور اعتماد
ا دیا ہے کہ میں ضرور رہا ہو جاؤں گا لیکن مقدمے کی کارروائی سن سُن کر مجھے اب
احسوس ہو رہا ہے گویا تقدیر مجھ پر بدتر حالات کا بوجھ اٹھاتی ہی جا رہی ہے ۔ ان
ت میں وثوق سے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا مستقبل کیا ہوگا"۔

کنول رو دی ۔

قیصر نے بات کو گہری کی طرف جاتے دیکھا تو فوراً رخ بدل دیا ۔

"تنویر ! میں پہلے پرجبیں سے بات کر چکا ہوں ۔ اُس نے کنول کی طرف دیکھا ۔میرا
ہ ہے کہ میں ——— میں پروین کو اپنا لوں"۔

تنویر نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر اُٹھایا ۔

"اچھی طرح سوچ لو بھیا ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں سلجھاہٹ کم اور الجھنیں
دہ ہیں"۔

قیصر نے خود اعتمادی سے کہا ۔

سطحی باتیں کرنے کا عادی میں بھی نہیں ۔ خوب سوچ چکا ہوں"۔

"پروین جن حالات سے گزر چکی ہے انہیں بھی آپ نے پیش نظر رکھا"؟

"ہر سو دیکھ چکا ہوں ۔ ہر پہلو پر غور کر چکا ہوں ۔ مجھے ایسی کوئی وجہ نظر نہیں
جو کبھی مستقبل میں میری زندگی کی راہوں پر اثر انداز ہو سکے ۔تمہارا مطلب یہی

ہے ناکہ پروین کا ماضی داغدار ہے۔ اور اِس بنا پر شاید ہم دونوں میں بے تعلقی پیدا ہو سکے۔"

تنویر نے گردن جھکالی۔

بس ڈر ہے تو اسی بات کا کہ میری بہن کو کبھی یہ نہ سُننا پڑے کہ اس کا ماضی "

—— تنویر کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اور وہ کھو سا گیا۔

قیصر جذباتی بن گیا۔

" اس بچاری کا کیا قصور۔ حالات نے زبردستی اس کے حلق میں زہر انڈیل دیا۔ اس معاشرے نے فن اور آرٹ کی آڑ لے کر عورت کی صحیح منزل سے دور جھٹکا دیا وہ وہ۔—— اگر اغوا نہ ہوتی اور اپنے گھر رہتی تو آج ایک پاک دامن گرہستی عورت ہوتی،

لیکن اُسے الجھا دیا گیا۔ بدنامی کی میلی زنجیروں میں۔

جکڑ دیا گیا۔ سماج کی پابندیوں میں۔ جن میں ایک طویل عرصہ تک وہ ماں کو ماں اور بھائی کو بھائی کہہ کر نہ پکار سکی۔ وہ بھی آخر پتھر تو نہیں۔ معاشرے کا ایک رکن ہے۔

حالات نے اگر گرا دیا تو ——

تو کیا ہُوا۔

فطرت نے اسے بھی عورت کا نام دیا ہے۔

اس کے بھی کچھ جذبات ہیں۔

دُکھ۔ غم اور درد کا اِسے بھی احساس ہوتا ہے۔

خبر نہیں آج کل کے مرد اپنے آپ کو کیا سمجھ بیٹھے ہیں عورت کبھی مجبوری سے بھی اگر بے آبرو ہو کر معاشرے میں گر جائے تو اسے حقیر، فاحشہ بدچلن اور جانے کیا کیا کہہ کر اور زیادہ دور گرایا جاتا ہے۔ کیا یہ مرد اپنے آپ پر غور نہیں کرتے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں ایسے ہوں گے جو جنسی بے راہ روی میں اس بازار بیٹھنے والی طوائف سے بھی بدتر ہوں گے۔ جنہوں نے نہ جانے کتنے معصوم پھولوں اور کلیوں کو اپنے ناپاک پاؤں تلے مَسلا ہو گا۔ پھر بھی معاشرہ ان کی طرف انگشت نمائی نہیں کرتا۔

آخر کیوں۔

" دونوں ایک ہی مٹی سے بنتے ہیں۔ مرد کوئی کہکشاں کا ستارہ تو نہ تھا جو ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔"

تنویر نے خوش طبعی سے کہا۔

" میں تمہارے جذبات اور خیالات کی قدر کرتا ہوں بھیا۔"

قیصر کچھ کچھ سنبھلا

" میں انشاء اللہ ان لوگوں کو جھوٹا ثابت کر دکھاؤں گا جو یہ کتابی جملہ دہرانے پھرتے ہیں کہ " رنڈی کسی کی نہیں ہوتی"۔ پروین کو اپنا کر میں ایک مثال پیش کروں گا۔ اگر گری سے گری عورت کو سازگار ماحول اور ایک شوہر کا پیار دیا جائے تو وہ بھی ایک مثالی عورت بن سکتی ہے۔"

تنویر نے ممنونیت سے کہا۔

اگر یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے تو میں التجا کروں گا کہ قبل اس کے کہ تقدیر

مجھے تختہ دار پر لا کھڑی کرے تم پروین سے شادی کرلو ۔ اور شہناز کی شادی منیر سے کر دو۔ موت سے بغلگیر ہوتے وقت جہاں مجھے اِس بات کا غم ہوگا کہ میں بے گناہ جا رہا ہوں وہاں اس بات کی خوشی بھی ہوگی کہ میری دونوں بہنیں زندہ ہیں اور خوش ہیں۔" کنول کھل کے رو دی۔ قیصر کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ قبل اس کے جواب میں کوئی کچھ کہتا اور تنویر واپس چلا گیا ۔

قیصر اور پروین کی شادی ہوگئی۔ دوسری طرف منیر اور شہناز نے بھی شادی کرلی کنول یلینہ، فرخندہ اور انیس تینوں شکل دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ ایک دفعہ انہیں گھر سے نکالنے ، بعد دوبارہ اِن سے ملنا اس نے پسند نہ کیا تھا منیر نے اپنے لیے ایک علیحٰدہ مکان لے یا تھا۔ جہاں وہ شہناز کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ خاندان میں وہی تو ایک خوش قسمت تھا جسے پی کنول جیسی بہن کا پیار ملا تھا ۔

ادھر وحید چند یوم ہسپتال میں رہنے کے بعد ٹھیک ہو چکا تھا تنویر سے اس نے معافی مانگ لی تھی اور اب بڑی تندہی سے وہ تنویر کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا اپنے اُجڑتے ہوئے گھر کو دوبارہ آباد کرنے کے لیے اس نے مسعود کی بیوہ بہن سے شادی کرلی تھی ۔ اور وہی گھر جس میں کبھی فریدہ کی وجہ سے لڑائی جھگڑا ہی رہتا تھا مسعود

کی بہن عاصیہ کے آجانے سے فردوس نما ہو گیا تھا۔ تنویر۔ وحید زندگی میں پہلی دفعہ بھائیوں کی طرح محسوس ہونے لگے تھے۔

تنویر جیل میں بیمار ہو گیا تھا۔ کنول، پروین، شہناز، عاصیہ، قیصر، وحید، مسود ا غیاث بڑی باقاعدگی سے اسے ملنے آرہے تھے۔ کنول ان دنوں بہت فکرمند تھی۔ بچ تنویر کے بغیر ایک ایک پل گزارنا اس کے بس سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔

دن گزر رہے تھے۔

آج تنویر کے مقدمے کا فیصلہ تھا۔ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ ایک طرف کنول دوسرے افراد کے ساتھ گم سُم اور اُداس کھڑی کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ عدالت کے فیصلے کے انتظار میں سرسوں کی طرح پیلا ہو گیا تھا۔ ٹانگیں اس کی کپکپا رہی تھیں اور پر بار بار پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں اُبھر آئیں۔

جج نے اپنی انگلیوں میں دبائے ہوئے قلم کو جنبش دی۔ اور ساتھ ہی اُس کی آواز بھی سنائی دی۔

وکیلوں کی بحث سے عدالت اِس فیصلہ پر پہنچی ہے کہ تنویر قاتل ہے۔ لہٰذا عدال اسے ——

"ٹھہرو!"

ایک برقعہ پوش خاتون کمرۂ عدالت میں داخل ہوتے ہوئے زور سے چلائی۔

جج نے گہری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کون ہو تم؟"

عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوتے ہوئے اِس خاتون نے نقاب اُلٹ دیا۔"

ظاہراً تو ایک عام عورت ہوں۔ لیکن حقیقت میں وہ لاش ہوں۔ جو اپنا وہ نام بھول چکی ہے جو پیدائش کے موقع پر ماں باپ نے رکھا تھا۔ ہاں سماج نے مجھے اور بہت م دیے ہیں۔ مثلاً طوائف، رنڈی، جسم فروش ——

اس کی زبان لڑکھڑانے لگی —— بتائیے کس نام سے تعارف کراؤں اپنا؟"

جج نے پُر رعب آواز میں کہا۔

"تمہارا اِس مقدمے سے کیا تعلق ہے؟"

خاتون نے برجستہ کہا۔

"وہی جو موت کا ہر انسان سے ہے"!

جج نے اکتاہٹ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"تم مقدمے کی کارروائی میں دخل اندازی کر رہی ہو"

آپ غلط سمجھتے ہیں، جج صاحب میں ایک بے گناہ کی مظلومیت اور بے گناہی کا ت بن کر آئی ہوں جو دھندلکوں میں کھو گیا تھا"۔ خاتون کی پلکیں بھیگ گئیں۔

جج صاحب! میں ایک معصوم زندگی کا راز لے کر آئی ہوں۔

کیا کہنا چاہتی ہو تم؟

اس نے برقعے میں چھپے ہوئے اپنے ڈوپٹے کا پلو نکال کر آنکھیں خشک کیں۔

میں کہنا چاہتی ہوں تنویر بے گناہ ہے۔"

جج چونک گیا۔

اس کا ثبوت؟

ثبوت میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ پروین جو کبھی زہرہ بائی تھی مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔ میں اور وہ اس بازار میں اکٹھی رہتی تھیں میرا نام نجمہ بائی تھا۔ اس بازار والوں نے ہم دونوں کو بچپن میں اغوا کر لیا تھا۔ خوش قسمتی سے پروین کی ماں اور بھائی تو اُسے مل گئے لیکن مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ میرے ماں باپ اور بھائی بہن کون ہیں۔

اس نے ذرا رک کے سانس لیا۔

جس دن پروین کے بھائی تنویر نے اُسے لینے کے لیے آنا تھا مجھے پروین نے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ لہٰذا میں نے اِرادہ کر رکھا تھا کہ پروین کے جانے میں اگر کوئی مزاحم ہوا تو میں ضرور پروین کی مدد کروں گی۔ دلالوں نے جب ریوالور دکھا کر تنویر کی کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا تو میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر کھڑے ہو کر فائرنگ کی اور تین دلالوں کے ساتھ اِس بوڑھی گھاگ عورت کو بھی ڈھیر کر دیا۔ جو عورتیں خریدنے کی ماہر تھی۔ میں نے جس کھڑکی میں سے فائرنگ کی تھی اس کا ایک پٹ بند اور دوسرا کھلا تھا۔

اچانک اُس نے جج کی طرف ایک ریوالور پھینک دیا۔

اس کے علاوہ بھی کوئی ثبوت چاہیے تو یہ ہے وہ پستول جس سے میں نے چار آدمی قتل کیا تھا۔

جج نے پستول الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر بھاری لہجے میں کہا۔

عدالت تنویر کو باعزت طور پر بری کرتی ہے گرفتار کر لو اس عورت کو"

کنول مارے خوشی کے جھوم گئی۔ پولیس کے سپاہی آگے بڑھے۔

اچانک خاتون نے برقعے کے اندر سے ایک اور ریوالور نکالا اور سپاہیوں کی طرف تانتے ہوئے وہ بپھر گئی "خبردار جو آگے بڑھا۔ مجھ میں اب عدالت کے بکھیڑوں میں پڑنے کی ہمت نہیں۔ میں گناہ کی ایک طویل زندگی بسر کر چکی ہوں۔ میں اب تھک گئی ہوں۔ زندگی میں شاید کوئی نیک کام نہ کیا ہو۔ لیکن میں خوش ہوں کہ موت سے پہلے ایک بے گناہ کو تختہ دار سے بچا کر زندگی میں پہلی بار نیکی کا ثبوت دے چکی ہوں" اس کے ساتھ ہی پستول وہ اپنی کنپٹی تک لے گئی۔ پھر دو گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور وہ خون میں نہا کر عدالت کے سامنے گر گئی سپاہی بھاگ کر آگے بڑھے لیکن۔

لیکن ——— وہ بیچاری ختم ہو چکی تھی۔

تنویر کٹہرے سے نیچے اُترا اور سر جھکائے کنول اور دوسرے افراد کے ساتھ عدالت سے باہر نکل گیا۔

رات خاصی گہری ہو گئی تھی۔

ہر سو اندھیرا پھیل گیا تھا۔

اندھیرا بھی اندھیرا سیاہ گور کا مہیب اور خوفناک۔ سرِ شام ہی سے سڑکوں اور گلیوں میں کھیلنے کودنے والے بچے گھروں میں دبک کر سو رہے تھے سڑکوں کے کنارے دور تک کھڑے بجلی کے کھمبوں سے ٹنگے ہوئے بلبوں کی زرد زرد اور نحیف سی روشنی گول دائرے کی شکل میں عجیب طرح سے اندھیرے کے ساتھ کشمکش میں مبتلا تھی۔

تنویر اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد اب بھی اُسے ہلکا ہلکا بخار تھا تاہم وہ سامنے بیٹھی ہوئی کنول کی خاطر بڑی بشاشت کا اظہار کر رہا تھا۔ منیر اور شہناز

اپنے گھر جاچکے تھے مسعود، غیاث اور وحید اور عاصیہ بھی ابھی ابھی وہاں سے نکلے تھے. ہاں قیصر اور پروین ابھی تک وہیں تھے کمرے میں گہری خاموشی تھی اچانک قیصر بھی اُٹھا. تنویر کو دوائی پلائی اور پروین کے ساتھ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کنول نے اُٹھ کر اندر سے کمرے کی زنجیر لگائی پھر تنویر کے پلنگ پر آبیٹھی اور اس کا سر اپنی گود میں لے کر ہلکے ہلکے دبانے لگی۔ تنویر نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

رہنے دو کنول میری طبیعت اب بالکل ٹھیک ہے

کنول نے اس کے ہاتھ چوم لیے۔

جھوٹ! آپ کا جسم تو ابھی گرم ہے۔

تنویر ایک دم سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

دیکھ لو. میں تو بالکل ٹھیک ہوں

کنول اُس کی اس ادا پر مسکرا دی. تنویر کے لیے اس کی یہ ہنسی راحت اور سکون کا پیغام تھا. خوش ہو کر اُس نے اِسے چھاتی سے لگا لیا. کنول کچھ دیر اس کے سینے سے لپٹی رہی پھر ——— پھر اس کی گود میں گر گئی - اور دوسرے روز تنویر بالکل صحت یاب ہو گیا. قیصر، پروین اور کنول کے ساتھ ناشتہ کرنے کے بعد جب وہ اُٹھنے لگا تو قیصر کو شاید اچانک کوئی بات یاد آگئی۔

میں اور پروین آج جا رہے ہیں تنویر!"

تنویر نے خالی نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

"کہاں!"

" کراچی - یہاں کا سارا کاروبار تمہارا حصہ ہے اور کراچی کی مل، دوکانیں اور کوٹھی میرا اور پروین کا حصہ ہو گا "

تنویز نے دکھ سے کہا۔

" آپ یہاں رہیں میں اور کنول کراچی چلے جائیں گے۔ "

" نہیں. آبائی مکان کا حقدار ہمیشہ چھوٹا بھائی ہوتا ہے. میں اور پروین نے کراچی جانے کا پکا ارادہ کر لیا ہے. اس میں اب ہم کوئی تبدیلی نہیں چاہتے تم بھی جلدی کپڑے بدل کے تیار ہو جاؤ. گاڑی چھوٹنے میں ابھی ایک گھنٹہ ہے تو تنویر سر جھکائے کنول کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

" فریدہ اور صادق اور قیصر اور پروین دونوں تنویر، کنول، منیر، شہنانہ، دیپا، عامر، غیاث، مسعود اور ان کی بیوی کے درمیان کھڑے باتیں کر رہے تھے - اچانک انجن نے وسل دی اور قیصر، پروین کو لے کر گاڑی میں سوار ہو گیا. جب ایک دھچکے کے ساتھ گاڑی رینگنے لگی پلیٹ فارم پر سب کھڑے ہاتھ ہلانے لگے. قیصر اور پروین بھی ہاتھ لہرا رہے تھے۔

تنویر کی حالت عجیب سی ہوتی جا رہی تھی. ہوا میں لہراتا ہوا اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے. جانے یہ سب کچھ قیصر کے خلوص کے باعث تھا یا بہن کی جدائی کی وجہ سے. قریب کھڑی کنول نے تنویر کی جو یہ حالت دیکھی. تو پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا. گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو تنویر اداس کھڑا خلاؤں میں گھورنے لگا. جیسے زندگی کا کوئی بہت ہی قیمتی حصہ فضاؤں میں کھو گیا ہو۔

سب پلیٹ فارم سے باہر آ گئے۔ تنویر کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ کنول اس کا بازو پکڑ کر باہر لائی۔ دوسرے سب لوگ وحید اور منیر کی کاروں میں بیٹھ گئے۔ کنول اسی طرح تنویر کا ہاتھ تھامے اپنی کار میں لائی۔ خود سٹیرنگ پر بیٹھ گئی اور تنویر کو اپنے ساتھ بٹھا دیا۔ قیصر اور پروین کے بچھڑنے کا ابھی تک اس پر گہرا اثر تھا۔ آنکھیں بند کر کے اس نے اپنا سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔ کنول نے اسے شانوں سے پکڑ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اپنا ایک بازو اس نے تنویر کی گردن میں پیار سے لپیٹ دیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے سٹیرنگ سنبھال لیا۔ پھر سے یہ مختصر کاریں آگے پیچھے کی طرف جا نکلیں۔ اور یوں مختلف افراد پر مشتمل ایک قافلہ زندگی کے غم، دکھ، درد کی طویل راہیں طے کرنے کے بعد خوشیوں کی ایک نئی شاہراہ پر رواں دواں ہو گیا۔